فروری ۱۹۹۰ء

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

اشاعتِ خصوصی

مشتمل بر

دعوت
رجوع الی القرآن
کا منظر و پس منظر

تالیف

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

حکمت قرآن

ماہنامہ — لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم — مدیر مسئول: ڈاکٹر اسرار احمد

جلد ۹ — جنوری۔فروری ۱۹۹۰ء مطابق جمادی الثانی۔رجب ۱۴۱۰ھ — شمارہ ۱،۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عاکف سعید

حرفِ اوّل

'حکمت قرآن' کا زیر نظر شمارہ جنوری اور فروری ۱۹۹۰ء کی دو اشاعتوں کا قائم مقام ہے اور اس کی حیثیت ایک خصوصی اشاعت کی ہے۔ چنانچہ اسی مناسبت سے اِس کی ضخامت بھی عام شماروں سے دو گنا بلکہ اس سے بھی متجاوز ہے اور اس کی قیمت بھی دو شماروں کے مساوی ہے۔

یہ شمارہ دراصل مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے صدر موسّس اور تنظیم اسلامی کے امیر، محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی زیر تالیف کتاب "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" کے ابتدائی دو حصّوں (Sections) پر مشتمل اور کُل کتاب کے لگ بھگ دو تہائی کے مساوی ہے۔ کتاب کا آخری حصہ ابھی زیر ترتیب ہے۔ خیال ہے کہ اسے مکمل ہوتے ابھی کئی ماہ کا عرصہ مزید لگے گا لیکن چونکہ آئندہ محاضراتِ قرآنی کے لئے جن کا انعقاد ان شاء اللہ وسط مارچ تک متوقع ہے، عنوان ہی

(باقی کور کے اندرونی صـ۳ پر دیکھئے)

مقامِ اشاعت: دفتر مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ فون: ۸۵۶۰۰۳

انتساب

اُن باہمّت نوجوانوں کے نام

جو حدیثِ نبویؐ

خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ

کو اپنا نصب العین بنالیں!

اور تعلّم و تعلیم قرآن کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں وقف کر دیں

بخاریؒ عن عثمانؓ ابن عفّان مرفوعًا

تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن کا علم حاصل کریں
اور اسے دوسروں تک پہنچائیں

ترتیب

○

مقدّمہ

صفحہ ۳

○

حصّۂ اوّل

دعوتِ رجُوع اِلی القرآن

موجودہ عالمی تہذیب کے تناظر میں

صفحہ ۳۱

○

حصّۂ دوم

دعوتِ رجُوع اِلی القرآن کا تاریخی پس منظر

صفحہ ۷۷

○

حصّۂ سوم

تحریکِ تعلّم و تعلیمِ قرآن

کے رُوح پرور منظر اور حیرت انگیز پیش رفت کا اجمالی خاکہ

صفحہ

○

چند ضمیمے

ع "گاہے گاہے باز خواں ایں قصّۂ پارینہ را!"

(نوٹ: 'حکمتِ قرآن' کے اِس شمارے میں حصّۂ دوم تک کے مضامین شامل ہیں)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

بیسویں صدی عیسوی کے آغاز اور چودھویں صدی ہجری کے ربعِ اوّل کے اختتام کے لگ بھگ جو عظیم شخصیت بیک وقت برِّعظیم پاک و ہند کے سیاسی و قومی افق پر بھی ضوفشاں تھی، اور ملّتِ اسلامیہ ہندیہ کے دینی و روحانی افق پر بھی خورشیدِ جہانتاب کے مانند چمک رہی تھی، وہ اسیرِ مالٹا مولانا محمود حسنؒ کی تھی، جنہیں ملّت کے باشعور طبقات نے بجا طور پر شیخ الہند کا خطاب دیا ——— انہوں نے تقریباً نصف صدی تک روایتی تدریس و تعلیم اور تصنیف و تالیف میں مشغول، اور جہادِ حریّت و استخلاصِ وطن میں سرگرم رہنے کے بعد، اپنی حیاتِ دنیوی کے آخری ایّام میں جبکہ ان کی عمر ستّر سال سے متجاوز ہو چکی تھی، اور بقول مولانا ابوالکلام آزاد "ان کا قد بھی اُن کے دِل کی مانند اللہ کے آگے جُھک چکا تھا" دارالعلوم دیوبند میں منعقدہ ایک اہم اجتماع میں حلقۂ دیوبند کے جملہ اکابر علماء کی موجودگی میں اپنی پوری نے چار سالہ اسیری کے دوران کے غور و خوض کا حاصل، اور تأمّل و تفکّر کا نچوڑ ان الفاظ میں بیان کیا:

"میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی، اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صَرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی میں قائم کیے جائیں۔ بڑوں کو **عوامی درسِ قرآن** کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔"

یہ روایت مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی ہے جو اُس اجلاس میں بنفسِ نفیس موجود تھے۔ اور انہوں نے اپنی تالیف **"وحدتِ امّت"** میں نہ صرف یہ کہ شیخ الہندؒ کے ان فرمودات کو نقل فرما کر امّت پر ایک احسان عظیم کیا، بلکہ ان پر یہ حکیمانہ اضافہ بھی فرمایا کہ :

". . . . قرآن کو چھوڑنا، اور آپس میں لڑنا، غور کیا جائے تو یہ آپس کی لڑائی بھی قرآن کو چھوڑنے ہی کا لازمی نتیجہ ہے۔ قرآن پر کسی درجہ میں بھی عمل ہوتا تو خانہ جنگی یہاں تک نہ پہنچتی۔" (وحدتِ امّت، صفحات ۳۹، ۴۰)

عام محاورے کے مطابق تو اسے حُسنِ اتفاق ہی سے تعبیر کیا جائے گا لیکن حقیقتِ نفس الامری کے اعتبار سے یہ بّرِ عظیم کے مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کے عظیم فضل و کرم کا مظہر ہے کہ عین اُس وقت (۱۹۲۰ء مطابق ۱۳۴۰ھ) جب مذکورہ بالا آفتابِ ہدایت غروب ہو رہا تھا آیاتِ قرآنیہ: "وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ۝ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ۝" کے مصداق —— اور حضرت شیخ الہندؒ کی اس گواہی کے عین مطابق کہ :

"میرے اُس درد کے غم خوار جس میں میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں۔" (خطبۂ علی گڑھ)

جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے حلقے سے علّامہ اقبال ایسے مفکرِ اسلام اور داعیٔ قرآن کی شخصیت ماہتاب عالمتاب کے مانند نمودار ہو چکی تھی —— اور الحمد للہ کہ اِس نابغۂ ملّت کی تشخیص و تجویز بھی بالکل یہی تھی کہ ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی — شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ — در بغل داری کتابِ زندۂ

اور ؎ گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جُز بقرآں زیستن
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست اُو — زندہ و پائندہ و گویاست اُو
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

اور ؎ برخور از قرآں اگر خواہی ثبات در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات

مزید برآں حضرت شیخ الہندؒ کے فرمودات پر حکیمانہ اضافہ مفتی محمد شفیعؒ نے کیا تھا، اس حکیم الامت نے اس کی توثیق بھی نہایت آب و تاب اور غایتِ جلال و جمال کے ساتھ کر دی ——— یعنی ؎

از یک آئینی مسلماں زندہ است پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است
ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست اعتصامش کن کہ "حبل اللہ" اوست[1]
چوں گہر در رشتۂ او سفتہ شو ورنہ مانندِ غبار آشفتہ شو!

گویا امتِ مسلمہ کے موجودہ زوال و اضمحلال اور ذلت و نکبت کے سبب کی تشخیص اور اس کے اصل علاج کی نشاندہی کے ضمن میں چودھویں صدی ہجری کے ان دونوں اعاظم رجال کی آراء ع "متفق گردید رائے بوعلی با رائے من" کے مصداق متحد اور متفق ہوگئیں، اور ایسا ہونا بالکل فطری تھا، چونکہ کلام الٰہی اور حدیثِ رسولؐ کو دونوں کے غور و فکر کے اصل مبنیٰ و مدار اور منبع و سرچشمہ ہونے کی حیثیت حاصل تھی، اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ واضح ارشاد صحیح مسلمؒ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں موجود ہے کہ "اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتٰبِ اَقْوَامًا وَّ يَضَعُ بِهٖ اٰخَرِيْنَ" یعنی "اللہ تعالےٰ اسی کتاب (قرآن حکیم) کی بدولت بہت سی قوموں کو بامِ عروج پر پہنچائے گا، اور اسی (کو ترک کرنے) کے باعث دوسروں کو رسوا کر دے گا"۔ جو درحقیقت توضیح اور ترجمانی ہے ان آیاتِ قرآنیہ کی کہ:

"وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ ط"[2]

اور "اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ○ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ"[3]

یعنی قرآن حکیم کسی شاعر کی لایعنی اور لاحاصل سخن سازی نہیں ہے بلکہ قوموں اور امتوں کے حق میں اللہ تعالےٰ کی عدالت کا مظہر بن کر نازل ہوا ہے اور اب اسی کی میزانِ عدل میں قوموں کی

---

[1] آیۂ قرآنی: "وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا" آل عمران: ۱۰۳

[2] سورۂ بنی اسرائیل - آیت: ۱۰۵ [3] سورۃ الطارق - آیات: ۱۳، ۱۴

قسمتیں تولی جائیں گی اور امتوں کی تقدیروں کے فیصلے ہوں گے۔

اِن سطور کا عاجز و ناچیز راقم اس عالمِ آب وگل میں حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بارہ سال بعد اور علاّمہ اقبال کی وفات سے چھ سال قبل (۱۹۳۲ء میں) وارد ہوا۔ اور جب اس نے شعور کی آنکھ کھولی تو یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت شیخ الہندؒ کو تو اُن کے اپنے حلقے کے لوگوں نے بھی فراموش کر دیا تھا[1] البتہ علاّمہ اقبال کا طوطی بول رہا تھا اور اُن کی کم از کم اُردو شاعری کا ڈنکا برِعظیم کے طول و عرض میں بج رہا تھا ——— اور اس سے پیدا شدہ جذبۂ ملّی تحریکِ پاکستان کی رُوحِ رواں بنا ہوا تھا۔ اِن حالات میں جب ۱۹۴۲ء میں راقم نے پانچویں جماعت کے طالبِ علم کی حیثیت سے "بانگِ درا" کی مشہور نظم "جوابِ شکوہ" پڑھی تو اس کا یہ شعر اس کے شعور میں پیوست ہو کر رہ گیا ؎

---

[1] میرے نزدیک اس کا سبب ؏ "اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شُدی!" کے مصداق حضرت شیخ الہندؒ کی وہ وسعتِ نظر، وسعتِ ظرف، اور وسعتِ قلب تھی جس کے تحت انہوں نے ایک[1] جانب تو وہ بات فرما دی جس کا حوالہ اُوپر آ چکا ہے۔ یعنی "میرے اس دَور کے غم خوار جس میں میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم، اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں!" ——— اور ظاہر ہے کہ مدرسوں اور خانقاہوں کے باسیوں کو یہ بات کسی طرح بھی اچھی نہیں لگ سکتی تھی۔ ——— اور دوسری[2] جانب اپنے تلامذہ، متوسّلین اور مسترشدین کے حلقے سے باہر کے ایک ستائیس سالہ نوجوان کے بارے میں نہ صرف یہ کہ یہ فرما دیا کہ "اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا ہے" بلکہ اپنے قلبی احساسات کی ترجمانی اس شعر کے ذریعے بھی کر دی کہ ؎ "کامل اس طبقۂ زہّاد سے اٹھا نہ کوئی۔ کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوتے!" ——— پھر ستم بالائے ستم یہ کہ ۱۹۲۰ء میں اپنے انتقال سے کچھ ہی دن پہلے یہ تجویز باصرار پیش فرمائی کہ جملہ علمائے کرام اسی نوجوان (مولانا ابو الکلام آزاد کی عمر اس وقت کل بتیس ۳۲ برس تھی!) کو امام الہند مان کر اس کے ہاتھ پر بیعت کر لیں ——— گویا حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے تلامذہ و متوسّلین کا معاملہ اس شعر کا مصداق کامل ہے کہ ؎

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں ——— اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا!

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

لہٰذا راقم نے اپنی نوجوانی میں اگرچہ عملاً تو اوّلاً مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ذریعے تحریکِ پاکستان میں حصّہ لیا، اور بعد ازاں اسلامی جمعیتِ طلبہ کے ذریعے تحریکِ اقامتِ دین سے وابستگی اختیار کی ——— لیکن اس عرصہ کے دوران، بحمداللہ، قرآنِ حکیم کے ساتھ اُس کے ذہن و قلب کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا ——— اور اس 'سَیر اِلَی القرآن' کے ضمن میں راقم جہاں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور اُن کی تفہیم القرآن' اور مولانا ابوالکلام آزاد اور اُن کے ترجمان القرآن سے متعارف ہوا، اور اسی طرح مولانا امین احسن اصلاحی اور اُن کے استاذ اور امام حمید الدین فراہیؒ کے طریقِ 'تدبّرِ قرآن' سے روشناس ہوا، وہاں الحمدللہ کہ ۱۹۵۲ء کے لگ بھگ اس کا ذہنی و قلبی رشتہ حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حواشی کے ذریعے سلفِ صالحین اور راسخون فی العلم کے "عُروۃ وثقیٰ" سے بھی قائم ہو گیا ——— اور اس کے بعد تین چار سال کے اندر اندر ہی راقم کے فہم و فکرِ قرآن کے ان 'ابعادِ ثلاثہ' پر ایک 'بُعدِ رابع' (FOURTH DIMENSION) کا اضافہ علّامہ اقبال کے فلسفیانہ، اور صحیح تر الفاظ میں متکلّمانہ اور متصوّفانہ افکار کا ہو گیا (جن کے ضمن میں راقم ڈاکٹر محمّد رفیع الدین، اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا مرہونِ منّت ہے)۔

راقم کے 'درسِ قرآن' کا چرچا زمانۂ تعلیم ہی میں اسلامی جمعیتِ طلبہ سے وابستگی کے دوران ہو گیا تھا۔ ۱۹۵۴ء میں ایم بی بی ایس کی تکمیل کے بعد راقم منٹگمری (حال ساہیوال) منتقل

یہی وجہ ہے کہ جب راقم نے پہلی بار مولانا سیّد حامد میاںؒ مہتمم جامعہ مدنیہ لاہور اور خلیفۂ مجاز سیّد حسین احمد مدنیؒ کے سامنے اپنی اس رائے کا اظہار کیا کہ چودھویں صدی ہجری کے اصل مجدّد حضرت شیخ الہندؒ تھے تو وہ ایک دم چونک سے گئے۔ اور انہوں نے میری رائے کی تصویب فرماتے ہوئے اعتراف کیا کہ حلقۂ دیوبند میں کسی کا ذہن ادھر نہیں گیا۔ اور نگاہیں یا مولانا اشرف علی تھانویؒ کی طرف اٹھتی ہیں یا مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی جانب!

ہوا تو اگرچہ اس کے بعد سے ۱۹۶۵ء تک کے گیارہ سالوں کے دوران حالات کے کئی اُتار چڑھاؤ آئے اور وصل و فصل کی متعدد داستانیں رقم ہوئیں، چنانچہ جماعتِ اسلامی سے وابستگی بھی ہوئی اور پھر سوا دو سال کے بعد علیحدگی بھی۔ مزید برآں دو مرتبہ کراچی نقل مکانی ہوئی، ایک بار ۱۹۵۸ء میں اقامتِ دین کی جدّوجہد کے لیے نئی رفاقت کی تلاش میں، اور دوسری بار ۱۹۶۲ء میں ایک مشترک خاندانی کاروبار کے سلسلے میں ——— لیکن الحمدللہ کہ اس پورے عرصے کے دوران ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار　　لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا!

کے مصداق درس و تدریسِ قرآن اور تعلّم و تعلیمِ قرآن کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔ چنانچہ ساہیوال میں تو نہ صرف یہ کہ مقامی طور پر میرے درسِ قرآن کا ڈنکا بج گیا تھا بلکہ آس پاس کے شہروں اور قصبوں یعنی اوکاڑہ، پاکپتن، چیچہ وطنی اور عارف والہ میں بھی ماہانہ درسِ قرآن کا سلسلہ چل نکلا تھا ——— اسی طرح کراچی میں بھی کبھی ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی مرحوم کے زیر اہتمام ——— اور کبھی خود اپنے ہی انتظام و انصرام میں درسِ قرآن کا سلسلہ جاری رہا ——— مزید برآں، کراچی کی پہلی نقلِ مکانی کے دوران راقم نے مولانا افتخار احمد بلخی مرحوم سے تفسیر بیضاوی کا ابتدائی حصّہ سبقاً سبقاً پڑھا اور دوسری نقلِ مکانی کے دوران اُن ہی کے اصرار پر کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لے کر ۱۹۶۵ء میں ایم اے اسلامیات کا امتحان پاس کر لیا۔ (جس میں اتفاقاً یونیورسٹی میں اوّل پوزیشن بھی آ گئی!)

۱۹۶۵ء ہی کے وسط میں راقم الحروف غلبہ و اقامتِ دین کی جدّوجہد کے پختہ ارادے اور تعلّم و تعلیمِ قرآن کی منظّم منصوبہ بندی کے عزمِ مصمّم کے ساتھ دوبارہ وارد لاہور ہوا۔ چنانچہ وہ دن اور آج کا دن یہی دو کام میری زندگی کا مرکز و محور رہے ہیں۔ اور اِن پچیس سالوں کے دوران، الحمدللہ، ثم الحمدللہ، کہ میرے اوقات اور میری صلاحیتوں اور توانائیوں کا اکثر و بیشتر حصّہ اصلاً غلبہ و اقامتِ دین کی جدّوجہد، اور عملاً تعلّم و تعلیمِ قرآن کی مساعی میں صَرف ہوا ہے۔

اِس رُبعِ صدی کے پہلے پانچ سالوں کے دوران تو ؎

ہے مشقِ سخن جاری، چکّی کی مشقّت بھی　　کیا طُرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی!

کے مصداق میڈیکل پریکٹس کا تسمہ بھی لگا رہا ـــــــــ بعد کے بیس سالوں کے دَوران تو ع "جو لکھا پڑھا تھا نیازؔ نے اُسے صاف دِل سے بھلا دیا!" ـــــــ اور ع "وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا!" کے مصداق یہ 'تہمت' بھی باقی نہ رہی ۔ اور 'نیتوں کا معاملہ تو اللہ ہی کے حوالے ہے' کم از کم ظاہری اور خارجی اعتبار سے اس پوُرے عرصے کے دَوران راقم 'ہمہ وقت' اور 'ہمہ وجوہ' اِن ہی مقاصدِ عظیمہ کے لیے 'وقف' رہا ۔ اور ناگزیر استراحت' اور ضروری علائق وحوائجِ دنیوی کے سوا راقم کے وقت کا کوئی لمحہ' اور اُس کی صلاحیت اور توانائی کا کوئی شمہ حصُولِ دنیا یا تلاشِ معاش کی ساعی میں صرف نہیں ہوا! فللہ الحمد والمنّۃ!!

اور اب جبکہ راقم کی عمر شمسی حساب سے اٹھاون' اور قمری تقویم سے ساٹھ برس ہوا چاہتی ہے' ـــــ اور راقم کی قلبی کیفیت فی الواقع وہی ہے جو انشاء اللہ خاں انشاؔ کے اس شعر میں بیان ہوئی کہ ؎

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں   بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں!

اور میں واقعتہً اپنے آپ کو الفاظِ قرآنی: "وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ۝" (الواقعہ: ۸۵) کے مصداق عالمِ آخرت سے قریب تر اور عالمِ دُنیا سے ذہناً اور قلباً بعید اور منقطع محسوس کرتا ہوں ـــــ جب کبھی تنہائی میں اپنی گزشتہ زندگی خصوصاً اُس کے چالیس سالہ شعوری دَور پر نگاہ ڈالتا ہوں تو ـــــــ اوّلاً تو نہ صرف یہ کہ اپنے باطن میں نہایت گہرے سکون اور اطمینان کا احساس ہوتا ہے کہ ع "جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے!" بلکہ قلب و روح کی سرزمین پر ایک جانفزا فرحت اور مسرت آمیز انبساط کی تسکین بخش پھوار سی پڑتی محسوس ہوتی ہے کہ ع "شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم!" ـــــــ اور اس کے معاً بعد قلب کی گہرائیوں سے شکرِ الٰہی اور حمدِ خداوندی کا چشمہ اُبلنے لگتا ہے کہ یہ سب اُسی تعؔ کا فضل و کرم اور اُسی تعؔ کی توفیق و تیسیر ہے' ورنہ من آنم کہ من دانم!! ـــــــ بلکہ یہ تو ایک مشہور مقولہ ہے جو غیر ارادی طور پر قلم سے ٹپک پڑا ورنہ واقعہ یہ ہے کہ یہ میرے حقیقی اور واقعی احساس کی تعبیر سے قاصر ہے' اس لیے کہ' بحمد اللہ' میرے سامنے تو ہر آن یہ حقیقت رہتی ہے کہ: "هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ

اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی" (النجم: ۳۲)

قارئین میرے اس اظہارِ اطمینان و انبساط کو کسی تعلّی، یا تکبّر، یا انتخابِ نفس پر محمول نہ کریں اس لیے کہ راقم کے نزدیک اس حقیقت کا شعور و ادراک تو ایمان کا صرف ابتدائی درجہ ہے کہ انسان کا کوئی ارادہ اللہ تعالےٰ کی توفیق و تیسیر کے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ اللہ کے فضل و کرم سے راقم الحروف کو تو اس امر کا بھی حق الیقین حاصل ہے کہ خود انسانی ارادہ بھی سراسر مشیّتِ الٰہی کے تابع ہے اور کسی نیک کام کی توفیق و تیسیر ہی نہیں، اُس کے ارادے کی ابتدائی تحریک بھی اُسی کی جانب سے ہوتی ہے ——— گویا معاملہ صرف "لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" ——— اور "لَا فَاعِلَ فِی الْحَقِیْقَةِ وَلَا مُؤَثِّرَ اِلَّا اللّٰهُ" ہی کا نہیں، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر "وَمَا تَشَاۗؤُنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَاۗءَ اللّٰهُ" (الدھر: ۳۰) کا ہے!! ——— اور میرے نزدیک "ثُمَّ جِئْتَ عَلٰی قَدَرٍ یٰمُوْسٰی ۝ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِیْ" (طٰہٰ: ۴۰-۴۱) کی کیفیت صرف حضرتِ موسیٰ علیہ السلام ہی کے لیے مخصوص نہیں، بلکہ مبدءِ فیاض کی جانب سے جس انسان کو بھی کسی خیر کی توفیق ارزانی ہوتی ہے اس کے معاملے میں کسی نہ کسی درجے میں اسی کیفیت کا انعکاس موجود ہوتا ہے!

اور "من آنم کہ من دانم" کے مصداق، ظاہر ہے کہ، یہ میں ہی جانتا ہوں کہ میرا ربّ مجھے کہاں کہاں سے بچا کر لایا ہے، کن کن مراحل پر اُس نے میری دستگیری فرمائی ہے، اور کن کن مواقع پر اُس نے مجھے گویا دھکیل کر اپنی راہ پر لگایا، اور کسی دوسری جانب متوجہ ہونے سے روکا ہے!

لہٰذا میرا اظہارِ مسرّت ہرگز کسی جذبۂ تفاخر و مفاخرت کی بنا پر نہیں، بلکہ محض "تحدیثاً لِلنِّعمة" ہے ——— اور شکرِ خداوندی، اور "وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ" (الضحیٰ: ۱۱) کی تعمیل کے علاوہ اگر کوئی اور جذبہ اس میں شامل ہے تو وہ بھی "فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِكُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِهٖ" (التوبہ: ۱۱۱) اور "فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا" (یونس: ۵۸) کے سوا کچھ نہیں۔

تو کیسے ممکن ہے کہ میں اظہارِ مسرت نہ کروں، بلکہ خوشیاں نہ مناؤں اس پر کہ اللہ تعالےٰ

نے اپنے ایک عاجز اور ناچیز بندے کو جس نے سکولوں اور کالجوں میں تعلیم پائی، اور جو کالج کی سطح پر نہ کبھی ادب یا فلسفہ کا طالب علم رہا، نہ عمرانیات یا اسلامیات کا، بلکہ سائنس اور طب کی تحصیل میں مصروف رہا ۔ ۔ "اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ" کے مصداق اپنی کتاب حکیم کے علم و حکمت اور خاص طور پر اُس کی دعوت کی نشر و اشاعت کے لیے اس درجہ "خالص" کر لیا کہ اسے سہ "ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم۔ اِلّا حدیثِ دوست کہ تکرار می کنیم!" کے مصداق تعلیم و تعلّمِ قرآن کے سوا دنیا کی کسی دوسری چیز سے کوئی دلچسپی نہ رہی، اور پھر اس کے درسِ قرآن کو اتنا قبولِ عام بخشا کہ وہ

"عوامی درسِ قرآن"

کے اُس خواب کی عملی تعبیر بن گیا جو لگ بھگ نصف صدی قبل چودھویں صدی ہجری کے مجدّدِ اعظم نے دنیا سے رحلت کے قریب دیکھا تھا! ع "یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے!"

رہا شکرِ خداوندی، تو واقعہ یہ ہے کہ اگر میرے ہر بُن مو بھی نہیں جسم کے ہر خُلیے کو زبان عطا ہو جائے جو ہر لحظہ اور ہر آن حمد و تسبیح میں مشغول رہے، تب بھی اللہ تعالےٰ کے اُس احسانِ عظیم اور فضلِ کبیر (جو یقیناً "اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا" بنی اسرائیل: ۸۷ ہی کا ایک ادنیٰ عکس ہے) کے شکر کا حق ادا نہیں ہو سکتا جو اس عبدِ ضعیف پر اس صورت میں ہوا کہ اس تعؔ نے اوّلاً اسے اپنی اُس کتابِ عزیز کے علم و فہم اور ہدایت و حکمت کے ساتھ ذہنی اور قلبی مناسبت عطا فرمائی جسے خود اُس تعؔ نے "اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝" کی رُو سے اپنی شانِ رحمانیت کا مظہرِ اعظم قرار دیا ہے اور پھر اُسے اس دَور میں کم از کم اُردو سمجھنے والے لوگوں کی حد تک "خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝" کی عملی تفسیر بنا دیا۔ اور اس "بیانُ القرآن" کے لیے اُس کے ذہن اور زبان کی گرہوں کو اس طرح کھول دیا کہ بلا مبالغہ سینکڑوں نہیں ہزاروں انسان اس کے درسِ قرآن کو مسلسل دو دو ڈھائی ڈھائی گھنٹے تک بالکل ساکن و ساکت اور ہمہ تن گوش ہو کر سنتے ہیں اور اُن کی دلچسپی بجائے کم ہونے کے بڑھتی چلی جاتی ہے!

ناواقف حضرات ان الفاظ کو یقیناً مبالغے پر محمول کریں گے، لیکن اس تحریر میں اس

حقیقتِ واقعی کے مفصّل شواہد پیش کرنا نہ ممکن ہے نہ مطلوب! البتہ وہ ہزاروں اشخاص جنہوں نے کبھی لاہور میں مسجد خضرا یا مسجد شہداء کے اتوار کی صبح کے ہفتہ وار درسِ قرآن کا منظر دیکھا ہے، یا جنہوں نے کراچی کی بے شمار مساجد میں درسِ قرآن کے اجتماعات اور اُن پر مستزاد تاج محل ہوٹل کے وسیع وعریض آڈیٹوریم میں "شامِ الہدیٰ" کی نشستوں میں سے کسی میں شرکت کی ہے، یا جنہیں ستمبر ۱۹۷۹ء میں ٹورنٹو (کینیڈا) کے چودہ روزہ درسِ قرآن کی کیفیات کے مشاہدے کا موقع ملا ہے، یا جنہوں نے دسمبر ۱۹۸۵ء میں ابوظبی کے ہفت روزہ مجالسِ درس کے شرکاء کے جوش و خروش اور ہجوم و اژدھام کی جھلک دیکھی ہے ——— اور سب سے بڑھ کر جنہوں نے اپریل ۱۹۸۴ء میں مکہ مسجد حیدرآباد (دکن) کا منظر دیکھا ہے جہاں مسلسل تین دن محتاط ترین اندازے کے مطابق پندرہ ہزار مردوں اور پانچ ہزار خواتین نے ڈھائی ڈھائی گھنٹے کے خطباتِ قرآنی میں انتہائی ذوق وشوق کے ساتھ شرکت کی تھی، وہ گواہی دیں گے کہ مبالغے کا کیا سوال، مندرجہ بالا الفاظ تو ان مجالس کی واقعی کیفیات کی بدرجۂ ادنیٰ ترجمانی سے بھی یکسر قاصر ہیں!

اسی طرح پاکستان ٹیلیویژن پر لگ بھگ چار سال تک راقم کے "بیان القرآن" کا جو ڈنکا بجتا رہا اس کی حسین اور خوشگوار یادیں، اس کی بندش پر ساڑھے سات سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود، لاکھوں نہیں کروڑوں لوگوں کے قلوب و اذہان میں اب تک تازہ ہیں۔ چنانچہ مسلسل تین سال تک پورے ماہ رمضان مبارک کے دوران افطار سے متصلاً قبل "الکتٰب" اور "الٓمّٓ" کروڑوں بندگانِ خدا کے لیے "نورٌ علیٰ نورٍ" کے مصداق روزہ کی برکات پر مستزاد رُوح کی بالیدگی کا سامان فراہم کرتے رہے، اسی طرح "حکمت و ہدایت" کے ذریعے ذہن و فکر کو قرآنی غذا ملی، تو "رسولِ کاملؐ" کے ذریعے قرآنی فلسفۂ رسالت، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوّت کے اختتام اور رسالت کی تکمیل کے عملی تقاضوں کے شعور کی خوشبو سے پاکستان کی فضائیں معطّر ہوئیں ——— اور سب سے بڑھ کر جب مسلسل پندرہ ماہ تک ہر ہفتے "الھُدیٰ" کے ہدایت آفریں اور ایمان پرور نغموں سے پاکستان کا طول وعرض وجد میں آگیا (اس لیے کہ یہ پروگرام پورے پاکستان میں نیشنل ہُک اَپ پر پاکستان کے تمام ٹیلیویژن اسٹیشنوں سے بیک وقت ٹیلی کاسٹ ہوتا تھا ——— تو ایک جانب اسے جو قبولِ عام حاصل ہوا، اور اس سے جو شہرت راقم کو حاصل ہوئی اس کی مقدار اتنی زیادہ

تھی کہ راقم کو اپنے بارے میں فتنہ و استدراج کے اندیشے لاحق ہو گئے ـــــ اور دوسری جانب "میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں ـ غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں!" کے مصداق الحاد اور اباحیت کے ایوانوں میں زلزلہ آ گیا اور مغرب کی مادر پدر آزاد تہذیب کے دلدادہ مردوں اور عورتوں کی جانب سے الامان و الحفیظ کا شور اُسی طرح بلند ہوا جس طرح کبھی حضرتِ موسیٰؑ کی للکار نے فرعون اور اس کے حواریوں کے ایوانوں میں " وَيَذۡهَبَا بِطَرِيقَتِكُمُ الۡمُثۡلٰى " کی دُہائی کی صورت میں ہوا تھا ـــــ یعنی 'یہ دونوں (موسیٰؑ اور ہٰرونؑ) چاہتے ہیں کہ تمہاری مثالی تہذیب کو تباہ اور تمہارے قابلِ فخر تمدن کو ملیامیٹ کر دیں' پس اپنی پوری قوت کو مجتمع کرو اور ان کے مقابلے کے لیے اُٹھ کھڑے ہو! گویا بقول اقبال ع "نظامِ کہنہ کے پاسبانو! یہ معرضِ انقلاب میں ہے!"[۱]

تو کیسے ممکن ہے کہ میری روح وجد میں نہ آئے اور میں اپنے باطن میں اُس کیفیت کے حامل "رقصِ جاں" کا مشاہدہ نہ کروں جس کا نقشہ عُرفی نے اپنے اس شعر میں کھینچا ہے کہ ؎

چہ خوش رقصید عُرفی بر درِ کاشانۂ وحدت ـ برہمن گفت ایں کافر چہ استادانہ می رقصد!

جبکہ میرے علم میں مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی یہ 'خبر' بھی ہے کہ:

"مَا اجۡتَمَعَ قَوۡمٌ فِي بَيۡتٍ مِنۡ بُيُوتِ اللّٰهِ يَتۡلُوۡنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَيَتَدَارَسُوۡنَهٗ بَيۡنَهُمۡ اِلَّا نَزَلَتۡ عَلَيۡهِمُ السَّكِيۡنَةُ وَغَشِيَتۡهُمُ الرَّحۡمَةُ وَحَفَّتۡهُمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيۡمَنۡ عِنۡدَهٗ"[۲]

بلکہ اس سے بڑھ کر وہ **'ضمانت'** بھی ہے جو اُس طویل حدیث کے آخر میں وارد ہوئی

---

[۱] اس پر بھی اللہ کا جس قدر شکر ادا کروں کم ہے کہ اس نے اس آزمائش میں بھی مجھے کامیابی عطا فرمائی اور میں نے ٹی وی سے مستقل انقطاع قبول کر لیا لیکن اپنے موقف میں کوئی لچک پیدا نہ کی!

[۲] مسلمؒ عن ابی ہریرہؓ: "جب بھی کبھی کچھ لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہو کر اس کی کتاب پڑھتے اور آپس میں سمجھتے سمجھاتے ہیں تو ان پر سکینت کا نزول ہوتا ہے، رحمتِ خداوندی ان پر سایہ کر لیتی ہے، فرشتے اُن کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں اور اللہ تعالےٰ ان کا تذکرہ اپنے (ملائکہ و ارواحِ مقربین کے سامنے کرتا ہے"

ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشاد فرمانے پر کہ: "اِنَّھَا سَتَکُوْنُ فِتْنَۃٌ" (عنقریب ایک بہت بڑا فتنہ رونما ہوگا) جب حضرت علیؓ نے سوال کیا: "مَا الْمَخْرَجُ مِنْھَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟" (اے اللہ کے رسولؐ اس سے بچ نکلنے کا راستہ کون سا ہوگا؟) تو اس کا کافی و شافی جواب تو آپؐ نے دو الفاظ میں ادا فرما دیا یعنی "کِتٰبُ اللّٰہِ" لیکن اس کے بعد اس کی مزید تشریح کے طور پر میں نے کتاب اللہ کی مدح اور اس کی عظمت کے بیان میں فصاحت و بلاغت کے جو موتی پروئے ان میں خود قرآن کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کا کامل عکس موجود ہے ـــــ اور جہاں اس بیانِ عظمتِ قرآن کے تین تین حسین جملوں پر مشتمل یہ حصے بھی لائقِ حفظ ہیں کہ:

فِیْهِ نَبَأُ مَا قَبْلَکُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَکُمْ وَحُکْمُ مَا بَیْنَکُمْ
وَھُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِیْنُ وَھُوَ الذِّکْرُ الْحَکِیْمُ وَھُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِیْمُ
لَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُهٗ وَلَا یَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا یَخْلَقُ عَنْ کَثْرَةِ الرَّدِّ
مَنْ قَالَ بِهٖ صَدَقَ وَمَنْ عَمِلَ بِهٖ اُجِرَ وَمَنْ حَکَمَ بِهٖ عَدَلَ

وہاں آخری نوید جانفزا تو اس قابل ہے کہ ہر خادمِ قرآن اسے حرزِ جاں بنا لے ـــــ یعنی:

"وَمَنْ دَعَا اِلَیْهِ فَقَدْ هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ" [1]

---

[1] جامع ترمذیؒ و سنن دارمیؒ: "● اس میں تم سے پہلے گزر جانے والوں کی اطلاعات بھی ہیں، اور تمہارے بعد پیش آنے والے حالات کی خبر بھی ہے اور تمہارے مابین ہونے والے جملہ اختلافات اور نزاعات کا حل بھی ہے۔ ● یہی اللہ کی مضبوط رسی ہے، اور یہی حکمت بھرا ذکر ہے، اور یہی صراطِ مستقیم ہے ● اس کی رعنائیاں کبھی ختم نہ ہوں گی اور اہلِ علم اس سے کبھی سیر نہ ہوں گے اور بار بار پڑھنے کے باوجود اس پر باسی پن طاری نہ ہوگا ـــــ ● جس نے اس کی بنیاد پر کوئی بات کی اُس نے سچ کہا، جس نے اس پر عمل کیا اس کا اجر محفوظ ہے، اور جس نے اس کی بنیاد پر فیصلہ کیا اس نے انصاف کیا ـــــ (اور سب سے بڑھ کر یہ کہ) جس نے اس کی جانب دعوت دی (خواہ کسی اور کو اس سے کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو) خود اُس کو صراطِ مستقیم کی ہدایت نصیب ہوگئی!!!

ان بشارتوں اور ضمانتوں پر بھی اگر کوئی 'داعی الی القرآن' فرطِ مسرت سے جھوم نہ اُٹھے تو یا تو اس کا وعظ و درس خالص ریاکاری پر مبنی ہے' اور اس کا ضمیر اسے متنبہ کرتا رہتا ہے کہ تم سیاری دوڑ دھوپ خالصتہً لوجہ اللہ نہیں کر رہے' یا اس کی ساری تگ و تاز صرف عقل اور حواس کی دلیوں تک محدود ہے' اور ع "گزر اُن کا ہوا کب عالمِ اللہ اکبر میں" کے مصداق قلب کی اُس وادی میں اس نے قدم ہی نہیں رکھا جہاں فطرتِ سلیمہ کی گہرائیوں سے شکر و حمد کے چشمے اُبلتے ہیں ـــــ اور انشراح و انبساط کے پھول کھلتے ہیں ـــــ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ "یَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ یُنْكِرُوْنَهَا" (النحل: ۸۳) کے جُرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔

اعاذنا اللہ من ذٰلك

معذرت خواہ ہوں کہ بات ع "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم" کے مطابق طویل ہو گئی حاصلِ کلام یہ کہ عمر کے اعتبار سے "شامِ زندگی" کے اُس دور میں قدم رکھتے ہوئے جس کے بعد "صبحِ دوامِ زندگی" ہی کے طلوع کا انتظار ہے' راقم بحمد اللہ اپنے ماضی کے بارے میں پوری طرح مطمئن ہے کہ ع "جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے!" اور ع "شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم!" ـــــ اور ایک عربی مصرعے "وَارْجُوْهُ رَجَاءً لَا یَخِیْبُ" کے مصداق راقم کو اُمیدِ واثق ہے کہ جس نے توفیق عطا کی اور تیسیر فرمائی' وہ شرفِ قبول بھی ضرور عطا فرمائے گا۔

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ[1]

راقم پر اللہ تعالیٰ کا مزید فضل و کرم یہ ہے کہ جس کام میں اس نے اپنی متاعِ زیست صَرف

---

[1] النمل: ۱۹ "اے میرے ربّ مجھے ہمت عطا فرما کہ میں تیرے اس فضل کا شکر ادا کر سکوں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیا، اور مجھے توفیق عطا فرما کہ میں وہ کام کروں جو تجھے پسند ہوں' اور اپنی رحمت کے طفیل مجھے اپنے نیک بندوں میں شامل فرما لے!"

کی، اور تحریکِ تعلّم و تعلیمِ قرآن کے جس پودے کو اُس نے اپنے خون اور پسینے سے سینچا اور پروان چڑھایا، اُس کے مستقبل کے بارے میں وہ بہت پُر امید ہے!

راقم کی یہ اُمید اصلاً تو ظاہر ہے کہ" وَاصۡبِرۡ وَمَا صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ " کے مطابق اللہ ہی کے سہارے قائم ہے، تاہم اُسی کے فضل وکرم سے عالمِ اسباب میں بھی اس امید کی پیدائش اور افزائش کے دو اسباب وجود میں آچکے ہیں:

ایک یہ کہ میرے دروس وخطبات کے سمعی اور بصری کیسٹ پوری دنیا میں بہت بڑی تعداد میں پھیل چکے ہیں۔ اِن کی صحیح تعداد کا علم تو ظاہر ہے کہ سوائے اللہ کے اور کسی کو نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ " اَحۡصٰی كُلَّ شَیۡءٍ عَدَدًا " (الجن: ۲۸) اُسی کی شان ہے۔ کتابوں کا معاملہ مختلف ہے، اُن کے ایڈیشن بھی گنے ہوتے ہیں اور ہر ایڈیشن کی تعداد بھی معلوم ہوتی ہے، بخلاف کیسٹوں کے، کہ اُن کے تو نقل درنقل کا سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے جو از خود دراز ہوتا چلا جاتا ہے اور کہیں سے کہیں جا پہنچتا ہے ——— تاہم محتاط اندازہ یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں میرے دروسِ قرآن اور خطباتِ قرآنی کے محض سمعی (آڈیو) کیسٹ تو پندرہ بیس لاکھ سے ہرگز کم نہ ہوں گے، اور سمعی وبصری (ویڈیو) کیسٹوں کی تعداد بھی بیس پچیس ہزار ضرور ہوگی، واللہ اعلم!

آڈیو کیسٹوں کا اہم ترین سلسلہ تو مطالعۂ قرآن حکیم کے میرے اپنے مرتّب کردہ منتخب نصاب کے دروس کا ہے جو میری اس قرآنی تحریک کی جڑ اور اساس ہے۔ اور چونکہ میں نے اس نصاب کا درس بارہا دیا ہے، کبھی مختصر اور کبھی نہایت مفصّل ومطوّل، لہٰذا اس کے کئی سیٹ موجود ہیں!

البتہ اس منتخب نصاب کے دروس کی ایک ریکارڈنگ وہ بھی ہے جو "کیز ایڈورٹائزنگ کمپنی کراچی" کے مالک لطف اللہ خاں صاحب کے ذوق وشوق اور اصرار و اہتمام کے نتیجے میں اُن کے ذاتی "ساؤنڈ پروف اسٹوڈیو" میں ٹھیک آدھے آدھے گھنٹے کے ٹکڑوں (CHUNKS) کی صورت میں ہوئی۔ اور چونکہ میرا یہ بیان ایک بند کمرے میں ہوا جس میں میرے اور خان صاحب موصوف کے سوا، کوئی "سامعین" موجود نہیں ہوتے تھے لہٰذا ان میں خطابت کا جوش وخروش تو بالکل نہیں ہے، تاہم ریکارڈنگ بھی صاف ہے اور اندازِ بیان بھی سادہ اور

عام فہم! لہٰذا ان کی مستقل افادیت کا دائرہ وسیع تر بھی ہے اور پائدار تر بھی ـــــ ایک ایک گھنٹے کے چوالیس ۴۴ کیسٹوں پر مشتمل یہ سیٹ بحمداللہ ہزاروں کی تعداد میں تیار ہوا اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کہاں کہاں تک پہنچا!

اسی طرح "حقیقت و اقسامِ شرک" کے موضوع پر میرے خطبات کے کیسٹوں کا ایک سیٹ بھی بحمداللہ بہت عام ہوا ـــــ اور جہاں بعض چوٹی کے علماء کے بارے میں اطلاع ملی کہ انہوں نے اس کی بہت قدر اور تحسین فرمائی وہاں بعض حضرات ایسے بھی علم میں آئے جنہوں نے ان کیسٹوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں پھیلانے ہی کو ایک مستقل مشن کے طور پر اختیار کر رکھا ہے۔ (یہ سیٹ ایک ایک گھنٹے کے چھ کیسٹوں پر مشتمل ہے!)

ستمبر ۱۹۷۹ء میں ٹورنٹو (کینیڈا) کے جس چودہ روزہ درسِ قرآن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اس کے مکمل کیسٹ ایک کرم فرما سمیع اللہ خان صاحب نے نہایت اہتمام اور محنت و مشقت سے تیار فرمائے جن کی ریکارڈنگ کا معیار نہایت اعلیٰ تھا۔ یہ سیٹ بھی بحمداللہ مشرق و مغرب میں بہت دُور دُور تک پہنچا۔

اسی طرح فروری ۱۹۷۸ء میں ماڈل ٹاؤن لاہور کی مختلف بلاکوں کی مساجد میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر نو ۹ تقاریر کا راؤنڈ مکمل کیا گیا تھا۔ اس کے ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے کے گیارہ کیسٹوں کا سیٹ بھی بڑی تعداد میں شائع ہوا۔

میرا ابتدا سے پورے قرآن مجید کا سلسلہ وار درس بیس سال میں تکمیل کو پہنچا ہے اس کی پوری ریکارڈنگ تو موجود نہیں ہے اس لیے کہ آغاز میں خاص اہتمام بھی نہیں تھا، علاوہ ازیں ابھی کیسٹوں کا رواج بھی نہیں ہوا تھا بلکہ ریکارڈنگ بھاری بھرکم ریکارڈروں کے ذریعے ٹیپ کی 'چرخیوں' (SPOOLS) میں ہوتی تھی، تاہم بحمداللہ بہت سے حصّوں کے بالخصوص بائیسویں پارے کے بعد کی اکثر و بیشتر سورتوں کے دروس کیسٹوں میں محفوظ ہیں!

اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ رمضان مبارک میں نمازِ تراویح کے ساتھ 'دورۂ ترجمۂ قرآن' کا جو سلسلہ پانچ چھ سال سے شروع ہوا ہے اس نے تو اللہ کے فضل و کرم سے فی نفسہٖ اور بجائے خود ایک مکمل تحریک کی صورت اختیار کر لی ہے، اور اس کے ۱۹۸۵ء کے ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹوں کے

ترسٹھ ۶۳، اور ۱۹۸۷ء کے ایک ایک گھنٹے کے تراسی ۸۳ کیسٹوں کے سیٹ سینکڑوں کی تعداد میں تو ہمارے اپنے اہتمام میں تیار ہو کر پھیل چکے ہیں۔ آگے یہ کہاں کہاں تک پہنچے اس کا حساب صرف اللہ کے پاس ہے۔

ان کے علاوہ بے شمار دینی موضوعات پر میری لاتعداد تقاریر آڈیو اور ویڈیو کیسٹوں میں محفوظ ہیں، اور گاہے گاہے ایسے لوگوں سے ملاقات ہوتی رہتی ہے جو راقم سے اپنا ابتدائی تعارف ہی اس حوالے سے کراتے ہیں کہ "میرے پاس آپ کے تین صد، یا چار صد، یا پانچ صد کیسٹ موجود ہیں!"

بصری (ویڈیو) کیسٹوں کا سلسلہ دیر میں شروع ہوا تھا ——— اور میرے علم کی حد تک اس کا پہلی بار خصوصی اہتمام رفقائے ابوظبی نے دسمبر ۱۹۸۵ء میں کیا تھا۔ وہاں کے نو ۹ روزہ پروگرام کے جو ویڈیو تیار ہوئے ان کا فنی معیار بہت بلند تھا، ——— لہٰذا وہ بھی ٹورنٹو کے آڈیوز کی طرح بہت بڑی تعداد میں لوگوں تک پہنچے ——— چنانچہ اُن کے حوالے سے کبھی کوئی خط جنوبی ہند اور سیلون سے آجاتا ہے تو کبھی جنوبی افریقہ سے، اور کبھی آسٹریلیا سے آجاتا ہے تو کبھی یورپ کے کسی ملک سے! وقس علیٰ ذٰلک!

اس کے بعد سے ویڈیو ریکارڈنگ کا سلسلہ بھی بڑے پیمانے پر چل نکلا۔ چنانچہ اس وقت صرف لاہور میں تیار ہونے والے تین تین گھنٹے کے ویڈیو کیسٹوں کے ایک سو چوبیس ۱۲۴ صد چار اساسی نسخے (MASTER COPIES) دفتر انجمن میں موجود ہیں۔ جن میں اہم ترین سیٹ ۱۹۸۷ء کے مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن، سورۂ قٓ سے سورۂ مرسلٰت تک کے مسلسل درسِ قرآن، اور مارچ ۸۹ء کے محاضراتِ قرآنی کے پروگرام میں ہونے والے "اسلام کے نظامِ عدل اجتماعی" کے خطبات پر مشتمل ہیں۔

ان پر ایک مستقل قسم (CATEGORY) کا اضافہ کر لیا جائے کہ اندرونِ ملک گزشتہ بیس سالوں کے دوران جن بے شمار شہروں اور قصبوں کے دورے میں نے کیے اُن کے دروس اور خطابات اور گزشتہ دس سالوں کے دوران امریکہ، یورپ، بھارت، سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں کے جو بیسیوں دورے میں نے کیے اور ان کے دوران سینکڑوں شہروں میں درس دیئے یا تقاریر کیں اُن کے جو آڈیو اور ویڈیو کیسٹ مقامی حضرات نے تیار کیے اور اُن کی جو نقول وہاں گردش میں ہیں اُن کا حساب بھی صرف عالم الغیب والشہادہ کے علم میں ہے!

اقبالؔ کے اس شعر کے مصداق کہ "فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا۔ یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک"، راقم کو یقین ہے کہ قرآن کی وہ انقلابی دعوت جو ان لاکھوں کیسٹوں کے ذریعے پورے کرۂ ارضی پر گونج رہی ہے[1] ہرگز بے نتیجہ اور غیر مؤثر نہیں ہو سکتی، اور جس طرح ایران کے انقلاب کو دنیا نے "کیسٹ ریوولیوشن" قرار دیا تھا اسی طرح، انشاء اللہ العزیز مستقبل کے اسلامی انقلاب اور اسلام کے عالمی غلبے کے ضمن میں راقم کے دروس و خطباتِ قرآنی کے یہ کیسٹ مؤثر اور فیصلہ کن رول ادا کریں گے ——— اور اوّلاً تو جیسے کہ میں نے اپنی تالیف 'استحکامِ پاکستان' میں دلائل و شواہد کی بنیاد پر عرض کیا ہے، اِس عالمی اسلامی انقلاب کا نقطۂ آغاز سلطنتِ خداداد پاکستان ہی بنے گا۔ لیکن اگر ہماری شامتِ اعمال سے پاکستان یہ سعادت حاصل نہ کر سکا تب بھی "فَاِنْ یَّکْفُرْ بِھَا ھٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَکَّلْنَا بِھَا قَوْمًا لَّیْسُوْا بِھَا بِکٰفِرِیْنَ" (الانعام: ۸۹) کے مطابق اللہ تعالیٰ ان کیسٹوں کے ذریعے پھیلنے والی دعوتِ قرآنی کو کسی اور زمین میں بارآور فرمائے گا ——— اس لیے کہ بحمداللہ یہ وقت کے ذہنی و فکری تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہے اور قلب و روح کے تغذیہ و تقویت کا بھی پورا سامان رکھتی ہے،

---

[1] ان کیسٹوں کے 'پھیلاؤ' کی وسعت کا کسی قدر اندازہ دو واقعات سے ہو سکتا ہے جو راقم کے حالیہ دورۂ امریکہ اور سفرِ بھارت کے دوران پیش آئے۔ (۱) سیراکیوز (امریکہ) میں جماعتِ اسلامی ہند کے قیّم جناب محمد فضل کے صاحبزادے ڈاکٹر عمر فضل سے ملاقات ہوئی تو اثنائے گفتگو میں ایک اسلامی تحریک کے سربراہ کا ذکر آ گیا، میں نے ایسے ہی کہہ دیا کہ میں نے سنا ہے کہ وہ میرے کیسٹ بہت سنتے ہیں تو عمر فضل صاحب کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل گئے: "آپ کے کیسٹ کون نہیں سنتا، اور کس کے پاس نہیں ہیں"۔ (۲) حیدرآباد دکن میں اکتوبر ۱۹۸۹ء کی پندرہ، سولہ اور سترہ تاریخوں کو گاندھی بھون کے پرکاشم ہال میں جو خطبات راقم نے "امّتِ مسلمہ کا ماضی، حال اور مستقبل" کے موضوع پر دیئے ان کے کیسٹ روز کے روز تیار ہو رہے تھے، اور پہلے دن کے کیسٹ اگلے روز بک جاتے تھے۔ آخری روز معلوم ہوا کہ گزشتہ روز کے خطاب کے سات سو کیسٹ تیار ہو سکے تھے جو سب کے سب بک گئے، اور مانگنے والے ابھی باقی تھے لہٰذا بہت سے حضرات محروم رہ گئے! فللہ الحمد والمنّۃ!

اگرچہ سب کچھ ہے محض اتّباع کی دین، اور اس کا کرم ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

تعلّم و تعلیم قرآن کی جس تحریک میں راقم الحروف نے اپنی حیاتِ مستعار کے پچیس سال بفضلِ ایزدی بالکل اُسی کیفیت کے ساتھ لگائے ہیں جسے انگریزی ضرب المثل میں شمع کو دونوں طرف سے جلانے سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کے مستقبل کے ضمن میں راقم کی 'رجائیت' کی دوسری اساس یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کی عنایت و رحمت سے گزشتہ دس سال کی مساعی کے نتیجے میں ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک جماعت تیار ہو چکی ہے جو بتوفیق و تیسیرِ خداوندی اس شمع کو روشن رکھنے اور اس تحریک کو آگے بڑھانے کی صلاحیت سے قابلِ اطمینان حد تک بہرہ ور ہو چکے ہیں ـــــ لہٰذا اُمّید واثق ہے کہ ان شاء اللہ العزیز اس شمع کی روشنی کم نہیں ہوگی بلکہ اس کی آب و تاب اور ضیا پاشیوں میں یَوْمًا فَیَوْمًا اضافہ ہوتا چلا جائے گا ـــــ اور اگرچہ راقم ان سب نوجوانوں کو بیٹوں ہی کی طرح عزیز رکھتا ہے، تاہم "نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ" کے مصداق یہ راقم پر اللہ تعالےٰ کے 'فضل بر فضل' کا مظہر ہے کہ ان میں راقم کے اپنے تین صُلبی بیٹے بھی شامل ہیں[1] "ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ" (یوسف : ۳۸)

---

[1] میرے فرزندِ اکبر ڈاکٹر عارف رشید سلمہٗ نے تو بحمد اللہ میرے 'اتباع' کا حق ادا کر دیا کہ بالکل میرے ہی مانند ایم بی بی ایس پاس کر کے میڈیسن کی لائن تج دی اور ہمہ تن و ہمہ وقت اسی تحریک تعلّم و تعلیمِ قرآن سے منسلک ہو گئے، اور اس وقت قرآن اکیڈمی کے جملہ انتظامی امور کی نگرانی کے علاوہ ہر ہفتے چار مقامات پر درسِ قرآن کے علاوہ ایک جامع مسجد میں جمعہ کا خطبہ بھی دے رہے ہیں۔ اور اس طرح گویا 'جوابِ شکوہ' کے اس شعر کا مصداق بن گئے ہیں کہ "باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو، پھر پسر لائقِ میراثِ پدر کیونکر ہو"۔ دوسرے بیٹے حافظ عاکف سعید سلمہٗ نے بھی ایم اے فلسفہ کرنے کے بعد اسی تحریک سے ہمہ تن و ہمہ وقت وابستگی اختیار کر لی۔ چنانچہ بحمد اللہ درس بھی دے رہے ہیں اور 'میثاق' اور 'حکمتِ قرآن' کی ادارت کے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

واضح رہے کہ یوں تو گزشتہ ربع صدی کے دوران جن لوگوں نے راقم کے دروس کے ذریعے اُس کے فکرِ قرآنی کو کما حقّہٗ اخذ کیا، اور بالخصوص مطالعۂ قرآنِ حکیم کے منتخب نصاب کے ذریعے دین کے ہمہ گیر تصوّر کے ساتھ ساتھ فرائض دینی کے جامع تصوّر کو بھی علیٰ وجہ البصیرت قبول کیا اُن کی تعداد ہزاروں میں ہے ــــــ اور ان میں ایک خاصی قابلِ لحاظ تعداد ایسے حضرات کی بھی ہے جو بوجوہ راقم کے ساتھ کسی تنظیمی سلسلے میں منسلک نہیں ہوئے لیکن اپنے طور پر قرآنِ حکیم کے اس انقلابی فکر کو عام کر رہے ہیں۔ چنانچہ گاہے گاہے ایسے حضرات سے ملاقات ہوتی ہے تو ایک قلبی مسرت اور روحانی سکون حاصل

(گزشتہ سے پیوستہ)

علاوہ طباعت و اشاعت کے جملہ کاموں کی نگرانی بھی اُن کے فرائض میں شامل ہے۔ مزید برآں قرآن کالج میں فلسفہ کی تدریس بھی کر رہے ہیں۔ تیسرے بیٹے حافظ عاطف وحید اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم ایس سی اکنامکس امتیازی حیثیت میں پاس کر کے قرآن کالج میں بحیثیت لیکچرر کام کر رہے ہیں چوتھے اور سب سے چھوٹے بیٹے عزیزم آصف حمید ابھی ایف ایس سی میں زیرِ تعلیم ہیں اور اگرچہ فی الحال کھیل کود کی جانب زیادہ رجحان رکھتے ہیں تاہم اللہ کے فضل و کرم سے امید ہے کہ وہ تعؔ مجھے ان کے بارے میں بھی محروم نہیں رکھے گا! (ویسے یہ عجیب اتفاق ہے کہ عزیزم آصف کی ولادت میری عین چالیسویں سالگرہ کے دن ہوئی یعنی ۲۶ اپریل ۱۹۷۲ء کو، اور اُن کی مزید 'خوش نصیبی' کی علامت یہ ہے کہ اُس روز ماہ ربیع الاوّل کی پاکستان کے حساب سے گیارہ اور عالمِ عرب کے حساب سے بارہ تاریخ تھی۔)

اپنی اولادِ نرینہ کے بارے میں ایک اور راز کی بات بھی عرض کر ہی دوں۔ راقم کو اللہ نے جب بھی حرم کی حاضری کا موقع عنایت فرمایا، طواف کی مستقل دعاؤں میں یہ دعا ہمیشہ شامل رہی کہ: "اے ربّ، تیرے علم میں مجھے جو بھی نسبت (خواہ ہزار میں ایک، خواہ لاکھ میں ایک) حضرت مجدّد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے ہے، وہی نسبت میرے بیٹوں کو حضرت مجدّدؒ کے عالی قدر صاحبزادوں اور شاہ صاحبؒ کے جلیل القدر فرزندوں کے ساتھ عطا فرما دے ــــــ وَلَا تَجۡعَلۡنِی بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِیًّا!" اور مجھے اپنے ربّ کی بے پایاں رحمت سے امید واثق ہے کہ وہ مجھے مایوس و محروم نہیں کریگا!

ہوتا ہے[1]۔ اسی طرح ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان بھی کم از کم پچاس کی تعداد میں ہیں جنہوں نے قرآن اکیڈمی کی دو سالہ تدریسی سکیم سے منسلک ہو کر عربی گرامر اور ترجمۂ قرآن کے ساتھ ساتھ قرآن کے اس انقلابی فکر کی باضابطہ تحصیل کی ہے ——— تاہم ابھی ایسے نوجوان جنہوں نے اس تعلّم و تعلیمِ قرآن ہی کو ایک مشن کی حیثیت سے اختیار کر لیا ہو بیس سے زیادہ نہیں ہے ——— اگرچہ اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے امیدِ قوی ہے کہ اس تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو گا اور اس طرح اس خواب کی عملی تعبیر بھی سامنے آجائے گی جو مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۵ء میں دیکھا تھا۔ یعنی :

"اگر ایک شخص مسلمانوں کی تمام موجودہ تباہ حالیوں اور بدبختیوں کی علّتِ حقیقی دریافت کرنا چاہے اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دے کہ صرف ایک ہی علّتِ اصلی ایسی بیان کی جائے جو تمام علل و اسباب پر حاوی اور جامع ہو تو اس کو بتایا جا سکتا ہے کہ علماءِ حق و مرشدینِ صادقین کا فقدان اور علماءِ سوء و مفسدین دجالین کی کثرت ——— رَبَّنَا اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا،

اور پھر اگر وہ پوچھے کہ ایک ہی جملہ میں اس کا علاج کیا ہے؟ تو اس کو امام مالک کے الفاظ

---

[1] اس کی ایک دلچسپ مثال قارئین کے لیے مفید ہو گی۔ ایک روز میں اسلام آباد ایئرپورٹ کے لاؤنج میں پرواز کی روانگی کے انتظار میں تھا کہ ایک عمدہ لباس میں ملبوس صاحب آکر میری برابر والی نشست پر بیٹھ گئے، اور مجھ سے سوال کیا: "آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟" میں نے عرض کیا کہ صورت تو کچھ شناسا سی معلوم ہوتی ہے۔ اس پر انہوں نے تعارف کرایا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک سرکاری محکمے میں بہت اعلےٰ عہدے پر فائز ہیں اور بہت عرصہ قبل میرے مسجد خضرا سمن آباد کے درس میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ پھر انہوں نے اپنا بریف کیس کھول کر مجھے منتخب نصاب کے ایک درس کے عربی متن کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں دکھائیں اور بتایا کہ "میرا معمول ہے کہ جب بھی کہیں سرکاری دورے پر جاتا ہوں اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی کے بعد لوگوں کو جمع کر کے آپ کے مرتّب کردہ نصاب کے اسباق کا درس دیتا ہوں۔ اور یہ سلسلہ میں نے کئی سال سے شروع کر رکھا ہے!" ——— اب ظاہر ہے کہ یہ توسّع "سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں!" کے مصداق صرف ایک مثال ہے!

میں جواب ملنا چاہیے کہ "لَا یَصْلُحُ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا" یعنی امتِ مرحوم کے آخری عہد کی اصلاح کبھی نہ ہو سکے گی، تاوقتیکہ وہی طریق اختیار نہ کیا جائے جس سے اس کے ابتدائی عہد نے اصلاح پائی تھی اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ قرآن حکیم کے اصلی و حقیقی معارف کی تبلیغ کرنے والے مرشدین صادقین پیدا کیے جائیں"

(ماخوذ از 'البلاغ' جلد اوّل، شمارہ اوّل مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء)

مولانا آزاد مرحوم نے اسی مقصد کے لیے ۱۹۱۵ء میں کلکتہ میں 'دارالارشاد' قائم کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ اُن کی دوسری سیاسی و ملّی سرگرمیوں نے انہیں اُس کی جانب توجہ کرنے کی فرصت نہ دی اور 'دارالارشاد' جلد ہی ع "آں قدح بشکست و آں ساقی نماند!" کی تصویر بن گیا۔ یادش بخیر، لگ بھگ بیس بائیس برس بعد 'قرآن اکیڈمی' کے دو سالہ تدریسی کورس سے ملتے جلتے پروگرام کے تحت علامہ اقبال کی تجویز کے مطابق اُن کے ایک معتقد اور دین و ملت کے دردمند شخص چوہدری نیاز علی خاں نے پٹھانکوٹ کے قریب سرنار ریلوے سٹیشن سے متصل 'دارالاسلام' قائم کیا تھا۔ لیکن مشیّتِ الٰہی سے علامہ اقبال اس ادارے کے قیام کے فوراً بعد انتقال فرما گئے اور تعمیر شدہ عمارات اگرچہ بعض دوسرے مفید مقاصد میں استعمال ہوئیں لیکن علامہ مرحوم کے اصل تصوّر کے مطابق کام کا آغاز بھی نہ ہو سکا۔

راقم کن الفاظ میں اللہ کا شکر ادا کرے کہ اُس نے ۱۹۶۷ء میں 'قرآن اکیڈمی' کا جو خواب دیکھا تھا، اُس کے لیے ۱۹۷۲ء میں ایک باضابطہ 'انجمن' قائم ہو گئی، ۱۹۷۶ء میں اُس کی تعمیر کا سنگِ بنیاد رکھا گیا، ۱۹۸۲ء میں 'قرآن اکیڈمی فیلوشپ اسکیم' کا آغاز ہوا، ۱۹۸۴ء میں 'دو سالہ تدریسی اسکیم' شروع ہوئی، اور ۱۹۸۷ء میں قرآن اکیڈمی کی کوکھ سے 'قرآن کالج' برآمد ہو گیا ——— راقم کو تو اس میں بھی جھلک نظر آتی ہے اُس تمثیلِ قرآنی کی کہ:

كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ (الفتح: ۲۹)

ویسے راقم کے نزدیک یہ اصلاً علامہ اقبال اور مولانا آزاد ہی کے خوابوں کی تعبیر ہے جو اللہ نے اپنے اس بندۂ ناچیز کے ذریعے ظاہر فرمائی: ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ!

اور اب کچھ باتیں پیشِ نظر تالیف کے مشمولات کے بارے میں!

جیسے کہ 'انتساب' سے ظاہر ہے یہ تالیف میں نے اصلاً اُن نوجوانوں ہی کے لیے مرتّب کی ہے جو حدیثِ نبویؐ: "خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ" کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنا لیں۔ ان شاء اللہ العزیز ایسے نوجوانوں کو اس کے ذریعے اُن موجود الوقت علمی و فکری اور تہذیبی و ثقافتی ظروف و احوال کا فہم و شعور بھی حاصل ہو جائے گا جن میں انہیں 'دعوت الی القرآن' کا فریضہ سرانجام دینا ہے' اور ع "اپنی خودی پہچان" کے مصداق اپنی اُس نسبتِ عالیہ کا ادراک بھی ہو جائے گا جو خدمتِ قرآن کے لیے اپنی زندگی وقف کرنے کے ناطے انہیں گزشتہ تین صدیوں کے اُن اعاظمِ رجال سے حاصل ہو گئی ہے جنہوں نے 'دعوت رجوع الی القرآن' کے شجرۂ طیبّہ کی آبیاری کی ہے ——— مزید برآں اللہ کے ایک بندۂ حقیر کی سرگزشت کے حوالے سے یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ اگر طلبِ صادق اور عزمِ راسخ ہو تو اللہ تعالیٰ ع "ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں" کے مصداق کیسی کیسی عنایتیں فرماتے ہیں' اور اپنے اس حتمی وعدے کے مطابق کہ "وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا" (العنکبوت: ۶۹) کیسے کیسے راستے کھولتے چلے جاتے ہیں۔ اور "وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ" (الحج: ۴۰) کی کیسی کیسی صورتیں سامنے آتی ہیں!

بنابریں یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے جن میں متذکرہ بالا معنوی ترتیب کے علاوہ ایک تاریخی ترتیب بھی ہے' یعنی حصّہ اوّل میں میری وہ تحریر شامل ہے جو میں نے ۱۹۶۷ء میں سپردِ قلم کی تھی' حصّہ دوم میری اُن تحریروں پر مشتمل ہے جو ۱۹۷۵-۷۶ء کے دَوران مختلف اوقات میں ضبطِ تحریر میں آئیں[1]، جبکہ حصّہ سوم میں وہ تحریر شامل ہے جو اوائل ۱۹۸۹ء میں مرتب ہوئی۔

ان میں ——— سے پہلی تحریر یعنی "اسلام کی نشأۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام" میری پوری قرآنی تحریک اور جملہ دعوتی و تنظیمی مساعی کے لیے بمنزلہ اساس ہے۔ چنانچہ اسی کو مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور اور قرآن اکیڈمی کے منشور (MANIFESTO) کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ اب تک ایک

---

[1] یہ مضامین چونکہ جُوں کے تُوں شائع کیے جا رہے ہیں لہٰذا ان میں بعض اُن اشخاص کا ذکر جو اب مرحومین کی فہرست میں شامل ہو چکے ہیں' زندہ شخصیتوں کے انداز میں کیا گیا ہے۔ قارئین اس معاملے کو نوٹ کر لیں تاکہ دورانِ مطالعہ الجھن نہ ہو!

کتابچے کی صورت میں اُردو میں کم و بیش پچاس ہزار اور انگریزی میں لگ بھگ پانچ ہزار کی تعداد میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ چونکہ راقم کے قلم کے رواں نہ ہونے کے باعث بہت مختصر بھی ہے اور کسی قدر مُغلق بھی، بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ یہ محض اشارات پر مشتمل ہے لہٰذا راقم نے بارہا خود اس کا 'درس' متعدد قرآنی تربیت گاہوں اور قرآن اکیڈمی کی مختلف کلاسوں میں دیا ہے ——— الحمدللہ کہ حال ہی میں اس مختصر تحریر کی توضیح و تفصیل پر مشتمل راقم کے لیکچرز کا ویڈیو بھی تیار ہو گیا ہے جو تین تین گھنٹے کے تین کیسٹوں میں مکمل ہو سکا ہے!

حصّۂ اوّل میں دوسری تحریر پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور کی ہے، جو موصوف نے میری تحریر کی تحسین اور تائید و توثیق کے لیے لکھی تھی۔ جس سے میری تحریر مزید مبرہن بھی ہو جاتی ہے اور اس کے بعض خلا بھی پُر ہو جاتے ہیں! بالخصوص یورپ میں الحاد و مادّہ پرستی کے فروغ اور فی الجملہ مذہب دشمنی کے اسباب بالکل نکھر کر سامنے آجاتے ہیں!

کتاب کا حصّۂ دوم چار ابواب پر مشتمل ہے:

اِن میں سے پہلا باب نہایت مختصر ہے یعنی کُل چھ صفحات پر مشتمل، لیکن یہ میری محبوب ترین تحریروں میں سے ہے۔ اس لیے کہ راقم کا گمان ہے کہ غالباً آج تک کسی نے اس حقیقت کی جانب توجہ نہیں کی کہ تاریخ اسلام کے قرنِ اوّل ہی میں بعض فطری اور منطقی اسباب کے نتیجے میں توجہات قرآنِ حکیم کی بجائے بعض دوسری چیزوں کی جانب منعطف ہو گئی تھیں اور یہی عمل ہے جو بعد کے ادوار میں تدریجاً بڑھ کر "مہجوریٔ قرآن" اور "قرآن کو چھوڑ دینے" کی اس کیفیت پر منتج ہوا جس کی نشاندہی علامہ اقبال اور حضرت شیخ الہندؒ نے کی! ——— لہٰذا اس کتاب کے ہر قاری سے میری یہ تاکیدی گزارش ہے کہ ان صفحات کو توجہ سے پڑھیں اور ان میں قرآن، ایمان اور جہاد کے مابین جو منطقی ربط بیان ہوا ہے اس پر خصوصی غور کریں۔

دوسرا باب بھی غایتِ اختصار کے باوصف ہندوستان میں اسلام کی پوری تاریخ کا اجمالی خاکہ پیش کر دیتا ہے جس سے ملّتِ اسلامیہ ہندیہ کے بحرِ محیط میں چلنے والی مختلف علمی و فکری اور تہذیبی و ثقافتی رَوؤں کی شناخت بھی ہو جاتی ہے اور ان کے تاریخی پس منظر سے آگاہی بھی، کسی

بھی تجدیدی سعی وجہد کے لیے شرطِ لازم کی حیثیت رکھتی ہے۔ مزید برآں اس میں امّتِ مسلمہ کی تاریخ کے الفِ ثانی کی پہلی دو صدیوں کی تجدیدی مساعی کا مختصر جائزہ بھی آگیا ہے، اور بحمداللہ حضرت مجدّد الفِ ثانی شیخ احمد سرہندیؒ، شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ، اور امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے تجدیدی کارناموں کے ساتھ ساتھ اُن کی اپنی شخصیتوں اور رجحانات کا تقابلی مطالعہ بھی بہت خوبصورتی سے آگیا ہے۔ ان میں سے چونکہ 'دعوت رجوع الی القرآن' کا نقطۂ آغاز شاہ ولی اللہؒ کی ذاتِ بابرکات ہے لہٰذا اُن کی 'قرآنی خدمات' کے اجمالی تعارف کے لیے شیخ محمد اکرام صاحب کی 'رودِ کوثر' سے ایک طویل اقتباس بھی اس باب کی زینت ہے۔

تیسرا باب تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری کے دوران 'دعوت رجوع الی القرآن' کی پیش قدمی کے جائزے کے علاوہ ہندوستان میں انگریزوں کے ورود کے بعد ملّتِ اسلامی کے لیے جو نئے مذہبی واعتقادی اور ملّی وسیاسی مسائل پیدا ہوئے ان کے مختصر مگر جامع جائزے پر مشتمل ہے۔ اس ضمن میں جو نہایت قیمتی بلکہ 'نادر' معلومات اس باب میں درج ہیں اُن کے لیے راقم پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کا مرہونِ منّت ہے، چنانچہ راقم خود بھی اُن کے لیے دست بدعا ہے اور قارئین سے بھی گزارش ہے کہ اُن کے حق میں دعائے خیر کریں۔

چوتھا باب خود راقم الحروف کی خوش نصیبیوں اور 'محرومیوں' کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ جس میں راقم نے ایک جانب اپنی اِس خوش بختی کی تفصیل بیان کردی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُس کے لیے اپنے خصوصی فضل وکرم سے ایسے حالات پیدا فرمادیئے کہ اُسے علم وفہم قرآنی کے چار چشموں سے سیراب ہونے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ اس کے ضمن میں راقم نے اپنے 'فکرِ قرآنی' کے چار ابعاد (FOURTH DIMENSION) کی تفصیل بیان کردی ہے۔ اس لیے کہ راقم کے درسِ قرآن کی مقبولیت کا راز دراصل اسی میں مضمر ہے کہ اس میں ابوالکلام آزاد اور ابوالاعلیٰ مودودی کی دعوتِ حرکت وجہاد کی للکار بھی موجود ہے، مولانا حمیدالدین فراہی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے تدبّر وتعمّق کا عنصر بھی شامل ہے، پھر ڈاکٹر محمد اقبال اور ڈاکٹر رفیع الدین کے سائنسی اور فلسفیانہ فکرِ قرآنی کی خوشہ چینی بھی ہے، اور سب سے بڑھ کر شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کے تمسّک بالاسلاف کا تحفّظ اور تصوّفِ قرآنی کی چاشنی بھی موجود ہے' ——— (عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ میرے فکری اسلاف میں دو شیخین

ہیں، تو دُو ہی 'ابوین' ہیں، اسی طرح دُو ہی 'دکتورین' ہیں اور دُو ہی وہ ہیں جن کے ناموں کے لاحقے یا سابقے نسبتی کی بنیاد پر مشابہ ہیں!)

اس باب کا ایک حصّہ بعض تلخ یادوں پر مشتمل ہے۔ بظاہر یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ اُن کو حذف کر دینے سے کتاب کی افادیت میں کوئی کمی نہ ہوتی لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس انجمن اور اکیڈمی کے تحت تحریک تعلّم و تعلیمِ قرآن کو آگے بڑھانا مقصود ہے، اُس کے داعی اور مؤسّس کے بارے میں ممکنہ اشکالات کا حل، اور بعض بزرگوں کے ضمن میں "وصل و فصل" کی داستان کے حقائقِ واقعی کی صراحت و وضاحت خود تحریک کے مصالح کے اعتبار سے ناگزیر ہے! اور بحمد اللہ راقم اس پر مطمئن ہے کہ اس تذکرے میں اُس نے ان بزرگوں کے ادب کو پُوری طرح ملحوظ رکھا ہے اور کہیں توہین آمیز انداز اختیار نہیں کیا!

کتاب کا حصّہ سوم حفیظ کے اس شعر کے مصداق کہ ؎ "تکمیل اور تدوینِ فن میں جو بھی حفیظ کا حصّہ ہے نصف صدی کا قصّہ ہے دو چار برس کی بات نہیں!" گزشتہ ربع صدی کے دوران تحریک تعلّم و تعلیمِ قرآن کے ضمن میں جو بھی کچھ راقم الحروف سے بن آیا ہے اُس کی رُوداد پر مشتمل ہے۔ اس کا اکثر و بیشتر حصّہ لگ بھگ ایک سال قبل راقم الحروف نے خود مرتّب کیا تھا جو 'حکمتِ قرآن' کی اشاعت بابت مارچ اپریل ۱۹۸۹ء میں شائع بھی ہو گیا تھا۔ اس میں راقم نے اپنی جدّوجہد اور مساعی کے ابتدائی مراحل کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے تاکہ خدمتِ قرآن کی اس پاکیزہ وادی کے نَو واردوں کے لیے نشاناتِ راہ واضح ہو جائیں۔ اور ان پر یہ حقیقت کما حقّہٗ منکشف ہو جائے کہ ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے!

اور ؎

طے می شود ایں رہ بدرخشیدنِ برقے ما بے خبراں منتظرِ شمع و چراغیم!

حصّہ سوم کا آخری جزو عزیزم ڈاکٹر عارف رشید سلمہٗ کا مرتّب کردہ ہے جس میں اس تحریک تعلّم و تعلیمِ قرآن کے اہم ترین ادارے یعنی 'مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' کی اٹھارہ سالہ کارکردگی کی ایک جھلک بنیادی طور پر اعداد و شمار کے حوالے سے پیش کی گئی ہے۔

آخر میں چند ضمیمے شاملِ کتاب ہیں۔ جن سے بیک نظر معلوم ہو جاتا ہے کہ گزشتہ بیس سالوں کے دوران اللہ کی توفیق و نصرت سے راقم نے اس دعوتِ قرآنی کے لیے کتنی تندہی اور جانفشانی سے کام کیا ہے اور اس کے لیے کتنی شدید مشقت جھیلی ہے، حالانکہ راقم کی صحت جسمانی کبھی قابلِ رشک نہیں رہی، ایف ایس سی کی تعلیم کے زمانے تک راقم نے نہ کبھی کسی کھیل میں حصہ لیا تھا نہ کسی تقریری مقابلے یا مباحثے (DEBATE) میں۔ بلکہ راقم ایک منحنی جسم اور خاموش طبع کا حامل نوجوان تھا ــــ لیکن پھر جیسے ہی دعوتِ اسلامی اور تحریکِ قرآنی کا داعیہ پیدا ہوا حیرت ہوتی ہے کہ قوتِ کار اور تحمّل و برداشت کے کیسے کیسے سوتے اُسی منحنی اور کمزور جسم کے اندر سے اُبل پڑے ــــــ میڈیکل کالج کے پانچ سالوں کے دوران راقم نے اسلامی جمعیتِ طلبہ میں جس محنت و مشقت کے ساتھ کام کیا اب اگر کبھی اُس کی یاد آتی ہے تو خود مجھے حیرت ہوتی ہے ــــ اسی طرح وسط ۱۹۶۵ء میں لاہور منتقل ہونے کے بعد سے ۱۹۷۲ء میں قیامِ انجمن تک راقم نے "وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا" کے مصداق خالص 'فرد' کی حیثیت سے بالکل یکّہ و تنہا جو مشقت جھیلی اس کی مختصر سی رُوداد راقم نے اپنے بعض ذاتی اور خاندانی کوائف کے ضمن میں سپردِ قلم کی ہے، جو تا حال نامکمل ہے، تاہم جتنا حصّہ شائع ہو چکا ہے اُس سے بھی جو نقشہ سامنے آتا ہے اُس پر خود مجھے تعجب ہوتا ہے کہ ع

"ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی!"

قیامِ انجمن کے بعد سے اب تک کے اٹھارہ سالوں کے دوران راقم کی مصروفیت کا دھندلا سا نقشہ سامنے لانے کے لیے ان ضمیموں میں پانچ پانچ سال کے وقفوں سے شائع ہونے والی بعض رپورٹوں کے اقتباس دیئے جا رہے ہیں۔ واضح رہے کہ ہمارے یہاں رپورٹوں کی تدوین کا کوئی مستقل اور باضابطہ نظام نہیں رہا، کبھی اتفاق ہی سے کوئی روداد مرتّب ہو کر شائع ہو جاتی تھی۔ ان میں سے بعض جن پر اتفاقاً ہی نظر پڑ گئی "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر ہدیۂ قارئین ہیں:

چنانچہ پہلا ضمیمہ جنوری ۷۲ء تا جون ۷۲ء حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن کراچی کی رُوداد پر مشتمل ہے جو رفیقِ مکرّم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے مرتب کی تھی اور 'میثاق' جولائی ۷۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ (واضح رہے کہ کراچی میں کام کا آغاز ۷۱ء ہی میں ہوا تھا)

دوسرا ضمیمہ 'میثاق' مارچ ۱۹۷۷ء میں شائع شدہ "رفتارِ کار" پر مشتمل ہے جس میں اواخر دسمبر ۷۶ء

یا اوائل فروری ۷۷ء کی کراچی کی رُوداد برادرم قاضی عبدالقادر صاحب کی مرتّب کردہ ہے اور لاہور چنیوٹ اور سکھر کی سرگرمیوں کا جائزہ شیخ جمیل الرحمٰن صاحب ہی کا تحریر کردہ ہے۔

تیسرا ضمیمہ 'میثاق' فروری ۱۹۸۲ء کے 'تذکرہ وتبصرہ' سے ماخوذ ہے جو خود راقم ہی نے تحریر کیا تھا۔ یہ ۲۸ دسمبر ۱۹۸۱ء سے ۲۸ جنوری ۱۹۸۲ء تک کے اسفار کی تاریخ وار رُوداد ہے جس کو اب تو پڑھنے ہی سے سر چکرانے لگتا ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ کبھی میرے شب و روز اس طرح کی "گردشِ مدام" کی صورت اختیار کر گئے تھے!

ان تینوں ضمیموں کی اشاعت سے اصل مقصود تحریک تعلّم و تعلیم قرآن سے وابستہ ہونے والے نوجوانوں کی ہمّت افزائی ہے کہ اگر مجھ ایسے کمزور اور مریض انسان کو اللہ اتنی ہمّت عطا فرما سکتا ہے تو اُن کو کیوں نہ عطا فرمائے گا۔ اللہ کی جناب سے تو ہر دم یہ ندا آتی ہے۔

یَا بَاغِیَ الْخَیْرِ اَقْبِلْ ـــــ وَ ـــــ یَا بَاغِیَ الشَّرِّ اَدْبِرْ!

گویا ؎ ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں — راہ دکھلائیں کسے، رہرو منزل ہی نہیں!

آخری ضمیمہ قرآن اکیڈمی کے دو سالہ تدریسی کورس کے پہلے گروپ کے سال اوّل کی رُوداد پر مشتمل ہے۔ یہ رُوداد بھی خود راقم الحروف ہی نے تحریر کی تھی اور مئی ۱۹۸۵ء کے 'حکمتِ قرآن' میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی اشاعت سے مقصد یہ ہے کہ ؎ "نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی" کے مصداق تصویر کا یہ دوسرا رُخ بھی نگاہوں کے سامنے آجائے کہ اگر کام کرنے کے لیے کمر ہمّت کس لی جائے تو اسی بگڑے ہوئے معاشرے اور ملحدانہ و مادّہ پرستانہ ماحول سے سعید رُوحیں نکل آتی ہیں۔ اور نہ مردانِ کار کی کمی رہتی ہے نہ وسائل و ذرائع کی۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ع "شرطِ اوّل قدم ایں است کہ مجنوں باشی" کے مصداق انسان اللہ کی تائید و نصرت پر بھروسہ کرتے ہوئے دیوانہ وار کام شروع کر دے۔

آخر میں جوانوں کے حق میں علامہ اقبال کی اس دُعا اور تمنّا کے ساتھ کہ ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے!

اور ؎

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر! — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر!
مرے قافلے میں لُٹا دے اسے! — لُٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے!!

اور خود اپنے اور اُن تمام لوگوں کے حق میں جو اللہ کے دین کی نصرت اور اس کی کتابِ عزیز کی خدمت میں مصروف ہوں اس دعا کے ساتھ کتاب ہدیۂ قارئین کرتا ہوں کہ:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا
مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ
اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنَا بِالْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ وَاجْعَلْهُ لَنَا
اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّهُدًى وَّرَحْمَةً — اَللّٰهُمَّ
ذَكِّرْنَا مِنْهُ مَا نَسِيْنَا وَعَلِّمْنَا مِنْهُ مَا جَهِلْنَا وَارْزُقْنَا
تِلَاوَتَهٗ اٰنَاءَ اللَّيْلِ وَاٰنَاءَ النَّهَارِ

وَاجْعَلْهُ لَنَا حُجَّةً يَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ
۲۱ دسمبر ۸۹ء

حصّہ اوّل

دعوت رجوع الی القرآن

موجودہ عالمی تہذیب کے تناظر میں

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ : کرنے کا اصل کام

فکرِ مغرب کی اساس اور اُس کا تاریخی پس منظر

بابِ اوّل

اِسلام کی نشأۃِ ثانیہ

کرنے کا اصل کام

قرآنِ حکیم کی اساس پر تجدیدِ ایمان اور احیاءِ علم کی نئی تحریک!

فرمانِ نبوی ﷺ[1]

مَنْ جَاءَهُ الْمَوْتُ وَهُوَ يَطْلُبُ الْعِلْمَ لِيُحْيِيَ بِهِ الْإِسْلَامَ فَبَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّبِيِّينَ دَرَجَةٌ وَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ

[1] رواہُ الدارمیؒ عن الحسن مرسلاً ورواہُ ایضاً الطبرانیؒ فی الاوسطِ عن ابن عباسٍ وکذا الخطیبُ عنہُ مرفوعاً
(لمعات التنقیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح)

- فکرِ مغرب کا ہمہ گیر استیلاء
- بنیادی نقطۂ نظر
- عالمِ اسلام پر مغرب کی سیاسی و فکری یورش
- مدافعت کی اوّلین کوششیں اور اُن کا ماحصل
- علومِ عمرانی کا ارتقاء
- اسلامی نظامِ حیات کا تصور اور بیسویں صدی عیسوی
- کی اسلامی تحریکیں
- تعبیر کی کوتاہی
- ’احیائے اسلام‘ کی شرطِ لازم: ’تجدید ایمان‘
- کرنے کا اصل کام
- عملی اقدامات

فکرِ مغرب کا ہمہ گیر استیلا

موجودہ دور بجا طور پر مغربی فلسفہ و فکر اور علوم و فنون کی بالادستی کا دور ہے۔ آج پورے کرۂ ارضی پر مغربی افکار و نظریات اور انسان اور کائنات کے بارے میں وہ تصورات پوری طرح چھائے ہوئے ہیں جن کی ابتدا آج سے تقریباً دو سو سال قبل یورپ میں ہوئی تھی اور جو اس کے بعد مسلسل مستحکم ہوتے اور پروان چڑھتے چلے گئے۔ آج کی دنیا سیاسی اعتبار سے خواہ کتنے ہی حصوں میں منقسم ہو تقریباً ایک ہی طرزِ فکر اور نقطۂ نظر پوری دنیا پر حکمران ہے اور بعض سطحی اور غیر اہم اختلافات سے قطع نظر ایک ہی تہذیب اور ایک ہی تمدن کا سکہ پوری دنیا میں رواں ہے۔ کہیں کہیں منتشر طور پر کوئی دوسرا نقطۂ نظر اور طرزِ فکر اگر پایا بھی جاتا ہے تو اس کی حیثیت زندگی کی اصل شاہراہ سے ہٹی ہوئی پگڈنڈی سے زیادہ نہیں ہے۔ ورنہ مشرق ہو یا مغرب ہر جگہ جو طبقے قیادت و سیادت کے مالک ہیں اور جن کے ہاتھوں میں اجتماعی زندگی اور اس کے جملہ متضمنات کی اصل زمام کار ہے وہ سب کے سب بلا استثناء ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ مغربی تہذیب و تمدن اور فلسفہ و فکر کا یہ تسلط اس قدر شدید اور ہمہ گیر ہے کہ بعض ان قوتوں کے نقطۂ نظر کا جائزہ بھی اگر دقتِ نظر سے لیا جائے جو مختلف ممالک میں مغربی تہذیب و تمدن کے خلاف صف آرا ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی مغرب کے اثرات سے بالکلیہ محفوظ نہیں ہیں اور خود ان کا طرزِ فکر بہت حد تک مغربی ہے۔

بُنیادی نقطۂ نظر

تہذیبِ جدید کی بنیاد میں جو فکر کام کر رہا ہے وہ نہ تو کوئی ایک دن میں پیدا ہو گیا ہے اور نہ ہی کوئی سادہ اور بسیط شئے ہے بلکہ ان ڈیڑھ دو سو سالوں کے دوران فلسفے کے کتنے ہی مکاتبِ فکر یورپ میں پیدا ہوئے اور کتنے ہی زاویہ ہائے نگاہ سے انسانوں نے انسان اور انسانی زندگی پر غور و فکر کیا ـــــ لیکن اس پورے ذہنی و فکری سفر کے دوران ایک نقطۂ نظر جو مسلسل پختہ ہوتا چلا گیا اور جسے بجا طور پر اس پورے فکر کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں 'خیالی' اور 'ماورائی' تصوّرات کے بجائے 'محسوس' حقائق و واقعات کو غور و فکر اور سوچ بچار کا اصل مرکز و محور ہونے کی حیثیّت حاصل ہے اور خدا کے بجائے کائنات، روح کے بجائے مادّہ اور موت کے بعد کسی زندگی کے تصوّر کے بجائے حیاتِ دنیوی کو اصل موضوعِ بحث قرار دیا گیا ہے۔ خالص علمی سطح پر تو اگرچہ یہ کہا گیا کہ ہم خدا، روح اور حیات بعد الممات کا نہ اقرار کرتے ہیں نہ انکار لیکن اس عدم اقرار و انکار کا نتیجہ بہر حال یہ نکلا کہ یہ 'تصوّرات' رفتہ رفتہ بالکل خارج از بحث ہوتے چلے گئے اور انسان کے سارے غور و فکر اور تحقیق و تجسّس کا مرکز و محور کائنات، مادّہ اور حیاتِ دنیوی بن کر رہ گئے۔

انسان کو اللہ تعالےٰ نے جن بے پناہ قوتوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے وہ انہیں جس میدان میں بھی استعمال کرے نتائج بہر حال رونما ہوتے ہیں اور ہر ڈھونڈنے والا اپنے اپنے دائرۂ تحقیق و جستجو میں نئی دنیائیں تلاش کر سکتا ہے ـــــ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جس طرح کائنات کی عظمت و وسعت کے اعتبار سے مہرِ درخشاں کی حیثیّت و وقعت ایک "ذرّۂ فانی" سے زیادہ نظر نہیں آتی لیکن اگر ایک "ذرّہ فانی" کی حقیقت و ماہیّت پر غور کیا جائے تو وہ بجائے خود "مہرِ درخشاں" کی عظمت و سطوت کا حامل نظر آتا ہے[1]۔ اسی طرح حقیقتِ

---

[1] مہرِ درخشاں ذرّۂ فانی ـــــ ذرّۂ فانی مہرِ درخشاں (کوثر)

ع "لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں" اقبال

نفس الامری کے اعتبار سے چاہے خدا کے مقابلے میں کائنات، روح کے مقابلے میں مادّہ اور حیاتِ اخروی کے مقابلے میں حیاتِ دنیوی کیسے ہی حقیر اور کتنے ہی بے وقعت ہوں اگر نگاہوں کو انہی پر مرکوز کر دیا جائے تو خود ان کی وسعتیں بے کراں اور گہرائیاں اتھاہ نظر آنے لگتی ہیں۔

چنانچہ یورپ میں جب کائنات اور مادّہ تحقیق و جستجو کا موضوع بنے تو یکے بعد دیگرے ایسے ایسے عظیم انکشافات ہوئے اور بظاہر خفتہ و خوابیدہ مظاہرِ قدرت کے پردوں میں ایسی ایسی عظیم قوتوں اور توانائیوں کا سُراغ ملا کہ عقلیں دنگ اور نگاہیں چکا چوند ہو کر رہ گئیں اور علم و فن کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہو گیا ——— قدرت کے قوانین کی مسلسل دریافت، فطرت کی قوتوں کی پیہم تسخیر اور نت نئی ایجادات و اختراعات نے ایک طرف تو یورپ کو ایک ناقابلِ شکست قوت بنا دیا اور دوسری طرف مادّے کی یہ عظمت اور اس کی قوتوں کی یہ سطوت بجائے خود اس امر کی دلیل بنتی چلی گئیں کہ اصل قابلِ التفات شئی مادّہ ہے نہ کہ روح اور کائنات اور اس کے قواعد و قوانین ہیں نہ کہ خدا اور اس کی ذات و صفات! ———!!

عالمِ اسلام پر مغرب کی سیاسی و فکری یورش

فطرت کی ان نو تسخیر شدہ قوتوں سے مسلّح ہو کر مغرب جب مشرق پر حملہ آور ہوا تو دیکھتے ہی دیکھتے ایک سیلاب کے مانند پورے کرّۂ ارضی پر چھا گیا اور مشرقی اقوام اور ان کی عظیم حکومتیں اور سلطنتیں اس سیلاب میں ریت کے کچّے گھروندوں کی طرح بہتی چلی گئیں۔ اس سیلاب کا اوّلین شکار چونکہ مشرقِ قریب اور مشرقِ وسطیٰ تھے جہاں مسلمان آباد تھے، لہٰذا اس کی سخت ترین یورش اسلام اور اہلِ اسلام پر ہوئی اور چند ہی سالوں کے اندر اندر پورا عالمِ اسلام یورپ کے زیرِ نگیں ہو گیا۔

عالمِ اسلام پر مغرب کا یہ استیلاء دوگونہ تھا یعنی عسکری و سیاسی بھی اور ذہنی و فکری بھی لیکن یورپ کی اوّلین اور نمایاں ترین یورش چونکہ سیاسی تھی لہٰذا عالمِ اسلام میں جو ردِّ عمل اس کے خلاف

پیدا ہوا اس میں بھی اوّلاً اسی کا احساس غالب نظر آتا ہے۔ ملّتِ اسلامی کے اس تلخ احساس نے کہ یورپ نے کہیں براہ راست تسلّط اور قبضے اور کہیں انتداب و تحفظ و حمایت کے پردے میں اسے اپنا محکوم بنا لیا ہے اور اسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اس کی وحدتِ ملّی کو پارہ پارہ کر دیا ہے، بارہا در دانگیز نالوں کی صورت اختیار کی اور اپنے شاندار ماضی کی حسرت بھری یاد، اپنی "عمرِ رفتہ" اور عظمت و سطوتِ گزشتہ کے بازیافت کی شدید تمنّا اور "گردشِ ایّام" کو پیچھے کی طرف لوٹانے کی بے پناہ خواہش نے کبھی سیّد جمال الدین افغانی کی سیماب وش شخصیّت کا رُوپ دھارا اور کبھی تحریک خلافت کی صورت اختیار کی لیکن حقائق نے ہر بار جذبات و خواہشات کا منہ چڑایا۔ اور مغرب کی سیاسی بالادستی رفتہ رفتہ ایک تسلیم شدہ واقعہ کی صورت اختیار کرتی چلی گئی۔

اپنے سیاسی تسلّط کو مستحکم کرتے ہی یورپ نے دنیائے اسلام میں اپنے افکار و نظریات کا پرچار اور اپنے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی تبلیغ ——— یعنی ذہنی و فکری تسخیر کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ نگاہیں مغرب کی مادّی ترقّی سے پہلے ہی خیرہ ہو چکی تھیں۔ پھر زندہ قوموں میں ہمیشہ کچھ بنیادی انسانی اوصاف لازماً موجود ہوتے ہی ہیں۔ کچھ ان کی بنا پر مرعوبیت میں اضافہ ہوا۔ نتیجتہً ایک مرعوب اور شکست خوردہ ذہنیّت کے ساتھ مسلمانانِ عالم کے سوادِ اعظم نے مغربی افکار و نظریات کو جُوں کا تُوں قبول کرنا اور حرزِ جاں بنانا شروع کر دیا ——— خالص فلسفہ و عمرانیات کے میدان میں تو چونکہ خود مغرب میں بے شمار مکاتبِ فکر موجود تھے لہٰذا ان کے بارے میں تو پھر بھی کسی قدر قیل و قال اور ردّ و قدح یا کم از کم ترجیح و انتخاب کا معاملہ کیا گیا لیکن سائنس چونکہ بالکل حتمی اور قطعی تھی اور اس کے نتائج بالکل محسوس و مشہود تھے اور اس میدان میں چُون و چرا کی کوئی گنجائش موجود نہیں تھی لہٰذا اس کا استقبال بالکل وحیِ آسمانی کی طرح ہوا اور اس کے نتیجے میں غیر شعوری طور پر ملحدانہ نقطۂ نظر اور مادّہ پرستانہ طرزِ فکر رفتہ رفتہ عالمِ اسلام کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگوں کے ذہنوں میں سرایت کرتا چلا گیا۔ اور خدا کے بجائے کائنات، رُوح کے بجائے مادّے اور حیاتِ اُخروی کے بجائے حیاتِ دُنیوی کی اہمیّت پُوری امّتِ مسلمہ حتّٰی کہ اس کے خاصے دیندار اور مذہبی مزاج کے لوگوں کے

نزدیک بھی مسلّم ہوتی چلی گئی۔

مدافعت کی اوّلین کوششیں اور اُن کا حاصل

مغربی فلسفہ وفکر کی اس یلغار کے مقابلے میں اسلام کی جانب سے مدافعت کی کوششیں بھی اس دوران میں ہوئیں اور بہت سے دردمند اور دین ومذہب سے قلبی لگاؤ رکھنے والے لوگوں نے ان کے تحفّظ کی سعی کی۔ تحفّظ ومدافعت کی یہ کوششیں دو طرح کی تھیں: ایک وہ جن میں محض تحفّظ پر قناعت کی گئی۔ اور دوسری وہ جن میں مدافعت کے ساتھ ساتھ مصالحت اور کسر و انکسار کی روش اختیار کی گئی۔

پہلی قسم کی کوشش وہ تھی جسے بقول مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم اصحابِ کہف کی سنّت کا اتّباع کہا جاسکتا ہے اور جس کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ زندگی کی شاہراہ سے ہٹ کر کونوں کھدروں میں بیٹھ جاؤ اور اپنے دین وایمان کو بچانے کی فکر کرو۔ اس قسم کی کوششیں اگرچہ بظاہر نری فراریت کا مظہر نظر آتی ہیں لیکن درحقیقت ان کی اساس خالص حقیقت پسندی اور اس اعتراف پر تھی کہ مغرب کی اس یلغار کے کھلے مقابلے کی سکت اس وقت عالمِ اسلام میں نہیں ہے لہٰذا ایک ہی راستہ کھلا ہے اور وہ یہ کہ اس سیلاب کے راستے سے ہٹ جایا جائے، اور ہر طرح کے طعن واستہزا کو انگیز کرتے ہوئے ایمان کی سلامتی کی فکر کی جائے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ کامیابی بھی تھوڑی بہت اگر کسی کو ہوئی تو صرف اسی طریق کار کے اختیار کرنے والوں کو ہوئی اور اس کے نتیجے میں امّت کے ایک حصّے کا ایمان بھی سلامت رہ گیا۔ مادّہ پرستی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں روحانیت کی شمعیں بھی کہیں کہیں جلتی رہ گئیں اور قال اللہ وقال الرسولؐ کی صداؤں میں دین وشریعت کا ڈھانچہ بھی محفوظ رہ گیا ——— اس قسم کی کوشش کا مظہرِ اتمّ برصغیر میں دارالعلوم دیوبند تھا جو کہنے کو تو صرف ایک درس گاہ تھا لیکن واقعتہً اس کی حیثیت ایک عظیم تحریک سے کسی طرح کم نہ تھی ———!

دوسری قسم کی کوششوں کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ ——— زمانے کا ساتھ بھی دیا جائے اور اسلام کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ اس مقصد کے تحت ایک طرف جدید افکار و نظریات کے صحیح و غلط اجزاء کو چھانٹ کر علیحدہ کیا جائے اور دوسری طرف اسلام کی ایسی جدید تعبیر کی جائے جس سے اس کی حقانیت ثابت ہو جائے۔

اس قسم کی کوششوں میں اوّل اوّل مرعوبیّت اور شکست خوردگی کے اثرات بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ مغرب کی عقلیّت پرستی (RATIONALISM) کی کسوٹی پر ہند و مصر کے کچھ نیم متکلّم قسم کے لوگوں نے اسلامی اعتقادات و ایمانیات کو پرکھنا شروع کیا۔ نتیجۃً اسلامی عقائد کی کتر بیونت اور اس کے ماورا۔ الطبعیاتی اعتقادات کی خالص سائنٹیفک توجیہیں شروع ہوئیں۔ ہندوستان میں سرسیّد احمد خاں مرحوم اور ان کے حلقہ اثر کے لوگوں اور مصر کے مفتی محمّد عبدہٗ اور ان کے تلامذہ کی نیتیں کتنی بھی نیک رہی ہوں اور انہوں نے کتنے ہی خلوص کے ساتھ اس کی کوشش کی ہو کہ اسلام کی جدید تعبیر اور ماڈرن توجیہہ کر کے اسے اس قابل بنایا جائے کہ وہ زمانے کا ساتھ دے سکے اور اس کے حلقہ بگوش اسے اپنے ساتھ لے کر ترقّی کی اُس راہ پر گامزن ہو سکیں جسے یورپ نے اختیار کیا تھا لیکن یہ بہرحال امرِ واقعہ ہے کہ اُن کی ان کوششوں سے دین و مذہب کی جان نکل کر رہ گئی اور مغرب کی مادّہ پرستانہ ذہنیّت کے تحت مذہب کا ایک کم و بیش لامذہبی ایڈیشن تیّار ہوا۔ جس کا اگر کوئی فائدہ ہوا تو صرف یہ کہ بہت سے ایسے لوگوں کو جو ذہن و فکر کے اعتبار سے ہی نہیں تہذیب و تمدّن کے لحاظ سے بھی خالص یورپین بن چکے تھے اپنے اُوپر سے اسلام کا لیبل اتارنے کی ضرورت نہ پڑی اور وہ مسلم قومیّت کے حلقے میں شامل رہ گئے اور دین کا یہ جدید ایڈیشن ان کی جانب سے مغرب کی خدمت میں بطورِ معذرت، پیش ہو گیا:

علومِ عمرانی کا ارتقاء

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، مغربی فکر کی اساس خدا، روح اور حیات

بعد المات کے عدمِ اقرار و انکار کے پردے میں درحقیقت انکار پر تھی۔ چنانچہ ایک طرف تو خدا کے بجائے کائنات اور رُوح کے بجائے مادّہ تحقیق و جستجو کا مرکز و محور بنے جس کے نتیجے میں سائنسی انکشافات و ایجادات و اختراعات کا سلسلہ شروع ہوا ——— اور دوسری طرف حیاتِ اُخروی سرے سے خارج از بحث ہوگئی، اور حیاتِ دنیوی گہرے غور و فکر اور شدید سوچ بچار کا موضوع بنی جس کے نتیجے میں مختلف عمرانی تصوّرات اور سیاسی و معاشی نظریات وجود میں آئے اور ان کی تالیف و تدوین سے مختلف نظام ہائے حیات پہلے علمی و فکری سطح پر اور پھر عالمِ واقعہ میں ظہور پذیر ہونا شروع ہوئے، چنانچہ ازمنہ وسطیٰ کے جاگیرداری نظام (FEUDAL SYSTEM) کے تحت جو سیاسی و معاشی ڈھانچہ عرصہ دراز سے دنیا میں رائج تھا اس کی جگہ سیاسی میدان میں قوم پرستی، آمریّت اور جمہوریّت کا رواج ہوا اور معاشی میدان میں سرمایہ داری اور سوشلزم برسرِکار ہوئے اور مختلف سیاسی و معاشی تحریکوں کا آغاز ہوا۔

اسلامی نظامِ حیات کا تصوّر اور بیسویں صدی عیسوی کی اسلامی تحریکیں

عمرانیات کے میدان میں مغرب کے اس فکری ارتقاء یا بالالفاظِ صحیح افراط و تفریط کے دھکّوں کا اثر عالمِ اسلام پر یہ پڑا کہ یہاں بھی لوگوں نے اسلام پر بطور نظامِ زندگی غور و فکر شروع کیا اور اسلام نے حیاتِ دنیوی کے مختلف شعبوں کے لیے جو ہدایات دی تھیں ان کی تالیف و ترتیب سے "اسلامی نظامِ حیات" کی تدوین ہوئی اور ساتھ ہی اس نظامِ زندگی کو دنیا میں عملاً نافذ کرنے کے لیے مختلف ممالک میں تحریکوں کا سلسلہ شروع ہُوا۔

بیسویں صدی عیسوی کی یہ اسلامی تحریکیں، جو انڈونیشیا سے مصر تک متعدّد مسلمان ممالک میں تقریباً ایک ہی وقت میں شروع ہوئیں، بہت سے پہلوؤں سے ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہیں اور یہ کہنا بہت حد تک صحیح ہے کہ تقریباً ایک ہی تصوّرِ دین ان کی پُشت پر کام کر رہا ہے اور ایک ہی جذبہ ان میں سرایت کیے ہوئے ہے ——— پھر یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی

وجہ سے عالمِ اسلام میں اسلام پر کم از کم ایک بہتر ضابطۂ حیات ہونے کے اعتبار سے عمومی اعتماد میں اضافہ ہوا ہے۔ اور نوجوان نسل کے ذہنوں سے مغرب کی عام مرعوبیت میں بحیثیتِ مجموعی کمی واقع ہوئی ہے۔

مغربی فلسفہ وفکر اور تہذیب وتمدّن سے مرعوبیت میں عمومی کمی کے کچھ دوسرے اسباب بھی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ مغرب کے سیاسی غلبے اور عسکری تسلّط کا جو سیلاب تیزی سے آیا تھا وہ نہ صرف یہ کہ رُک گیا ہے بلکہ مختلف ممالک میں قومی تحریکوں نے اس کا رُخ پھیر دیا ہے اور مغرب اپنی سیاسی بالادستی کی بساط رفتہ رفتہ تہہ کرنے پر مجبور ہو گیا ہے[1]۔ اور اگرچہ تحفّظ وحمایت کے پردے میں سیاسی بالادستی اور تعاون وامداد کے پردے میں معاشی تفوّق وبرتری کے بندھن ابھی باقی ہیں، تاہم تقریباً پورا عالمِ اسلام مغربی طاقتوں کی براہِ راست محکومی سے آزادی حاصل کر چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ مغربی تہذیب وتمدّن کا کھوکھلا پن تجربے سے ثابت ہو گیا اور خود مغرب میں محسوس کیا گیا کہ اس کی بنیاد غلط اور تعمیر کج ہے۔ خصوصاً مادہ پرستانہ الحاد جب اپنی منطقی انتہا کو پہنچا اور اس کی کوکھ سے سوشلزم اور کمیونزم نے جنم لیا اور انہوں نے انسانیت کی بچی کھچی اقدار کو بھی 'ٹھوس' معاشی مسئلے کے بھینٹ چڑھانا شروع کیا تو خود مغرب پریشان ہو گیا اور وہاں بھی نہ صرف انسانیت بلکہ دبی آواز میں روحانیت تک کا نام لیا جانے لگا۔ تیسرے یہ کہ نہ صرف یہ کہ خود سائنس کی قطعیت اور حتمیّت ختم ہو گئی اور کچھ نئے نظریات نے نیوٹن کی طبعیات اور اقلیدسی ہندسے کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں بلکہ خود مادّہ ٹھوس نہ رہا اور تحلیل ہو کر قوّتِ محض کی صورت اختیار کر گیا۔ چنانچہ مابعد الطبعیاتی عقائد کا اقرار نسبتاً آسان ہو گیا اور مذہب کو بحیثیتِ مجموعی کسی قدر سہارا ملا۔ چوتھے یہ کہ مختلف مسلمان ممالک میں جب آزادی اور خود اختیاری کے حصول کے لیے قومی تحریکیں اٹھیں تو چونکہ مسلم قومیّت کی اساس بہرحال مذہب پر ہے لہٰذا جذبۂ قومی کی انگیخت کے لیے

---

[1] دولتِ برطانیہ نے جس طرح رفتہ رفتہ اپنی عظمت کی بساط لپیٹی ہے وہ تو اِس دور کا ایک نہایت ہی عبرت آمیز واقعہ ہے۔

لامحالہ مذہبی جذبات کو اپیل کیا گیا جس سے احیائے اسلام کے تصوّر کو تقویت پہنچی۔

مندرجہ بالا اسباب و عوامل سے تقویّت پاکر 'احیائے اسلام'، 'قیامِ حکومتِ الٰہیہ' اور 'نفاذِ نظامِ اسلامی' کی تحریکیں مختلف مسلمان ممالک میں برسرِ کار ہوئیں۔ جن میں قوّت و وسعت اور جذبہ و امنگ کے اعتبار سے مصر کی 'الاخوان المسلمون' اہم تر تھی لیکن ایک ٹھوس اور مضبوط فکر کی حامل ہونے کے اعتبار سے برّصغیر پاک و ہند کی 'جماعتِ اسلامی' کو نمایاں مقام حاصل تھا۔

یہ تحریکیں تقریباً ثلث صدی[1] سے مختلف مسلمان ملکوں میں برسرِ عمل ہیں اور ملّتِ اسلامی کی نوجوان نسل کا ایک خاصا قابلِ ذکر حصّہ ان کے زیرِ اثر آیا ہے لیکن عملاً ان میں سے کسی کو کوئی نمایاں کامیابی کہیں حاصل نہیں ہو سکی۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں اپنا وقت پورا کر چکی ہیں اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے خواب کی تعبیر کا وقت ابھی نہیں آیا۔ چنانچہ مصر میں 'اخوان المسلمون' کا اندرونِ ملک تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے[2] اور اس کے باقیات الصالحات جلاوطنی کے عالم میں دُوَلِ عرب کی باہمی آویزش کے سہارے جی رہے ہیں۔ رہی برّصغیر کی تحریکِ اسلامی تو اس کا جزوِ اعظم پاکستانی سیاست کے نذر ہو چکا ہے اور اب اس کا مقام تحریکِ جمہوریّت کی حاشیہ برداری سے زیادہ کچھ نہیں رہا۔[2]

ان تحریکوں کی ناکامی کا سبب بظاہر تو یہ ہے کہ انہوں نے بے صبری سے کام لیا اور اپنے اپنے ملکوں میں سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی معتدبہ تعداد کے ذہنوں کو بدلے بغیر سیاست کے میدان میں قدم رکھ دیا۔ جس کے نتیجے میں قومی قیادتوں اور ترقّی پسند عناصر سے قبل از وقت تصادم کی نوبت آگئی لیکن درحقیقت ان کی ناکامی براہِ راست نتیجہ ہے ان کے تصوّرِ دین کی خامی اور مطالعۂ اسلام کے نقص کا۔

---

[1] واضح رہے کہ یہ تحریر آج سے بیس سال قبل کی ہے۔ اب ان تحریکوں کی عمر نصف صدی سے متجاوز ہو چکی ہے۔ [2] یہ بات بھی آج سے دس سال قبل تک تھی گزشتہ دس سالوں کے دوران جماعت نے فوجی آمریت کے ساتھ 'شریفانہ سمجھوتہ' کر کے اپنی پوزیشن خراب کر لی ہے!

تعبیر کی کوتاہی!

ذرا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تحریکوں کا مطالعہ اسلام اسی مغربی نقطۂ نظر پر مبنی ہے جس میں روح پر مادّے اور حیاتِ اخروی پر حیاتِ دنیوی کو فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ اسلام کے ان ماوراء الطبیعاتی اعتقادات کا اقرار تو ان کے یہاں موجود ہے جن کے مجموعے کا نام ایمان ہے لیکن انہیں کچھ زیادہ درخورِ اعتناء اور لائقِ التفات نہیں سمجھا گیا اور نگاہیں کلیتہً اس ہدایت و رہنمائی پر مرکوز ہیں جو حیاتِ دنیوی کے مختلف شعبوں کے لیے اسلام نے دی ہیں اور جن کے مجموعے کا نام 'اسلامی نظامِ زندگی' رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ کی ہستی کا اقرار تو موجود ہے لیکن 'ایمان باللہ' کی وہ کیفیت کہ آفاق و انفس میں تنہا وہی فاعلِ مطلق، مؤثرِ حقیقی اور مسبّب الاسباب 'نظر' آنے لگے، بالکل مفقود ہے۔ آخرت کا اقرار تو کیا جاتا ہے لیکن اس پر ایسا ایمان کہ "کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ"[1] کی کیفیت پیدا ہو جائے قطعاً ناپید ہے۔ رسالت کا اقرار تو ہے لیکن محبّتِ رسولؐ نام کو موجود نہیں اور مقامِ رسالت کا تصور زیادہ ترقی پسند لوگوں کے نزدیک تو ڈاک کے ہرکارے اور صرف اپنی زندگی میں ملّت کے مرکز یعنی رہبر و مطاع سے زیادہ نہیں[2] اور جو سنّت کے مقام سے زیادہ آگاہ ہیں انہوں نے بھی سنّتِ عادت اور سنّتِ رسالت کی تقسیم سے ایسا چور دروازہ پیدا کر لیا ہے جس سے کم از کم اپنی نجی زندگیوں کی حد تک زمانے کا ساتھ دینے کی آزادی برقرار رہے! گویا 'ایمان' کا صرف وہ اقرار پایا جاتا ہے جو قانونی اسلام کی بنیاد ہے اور یہ کیفیت کہ ایمان انسان کا 'حال' بن جائے نہ صرف یہ کہ موجود نہیں ہے بلکہ اس کی کسی ضرورت و اہمیت کا احساس بھی سرے سے عنقا ہے۔!

---

[1] حدیثِ نبویؐ: ـــــ دنیا میں ایسے رہو جیسے اجنبی یا مسافر!

[2] اس مکتب کی زوردار نمائندگی کا شرف ہمارے یہاں جناب غلام احمد پرویز کو حاصل ہے۔ یہاں اس مکتبِ فکر کے حوالے سے صرف یہ مقصود ہے کہ واضح ہو جائے کہ یہ بھی تعبیر کی اصلاً اسی غلطی کی اگلی منزل ہے!

اسی نقطۂ نظر کا کرشمہ ہے کہ دین اسٹیٹ (STATE) کا ہم معنی قرار پایا ہے اور عبادت اطاعت کے مترادف ہو کر رہ گئی ہے۔ نماز کا یہ مقام کہ وہ معراج المومنین[1] ہے نگاہوں سے بالکل اوجھل ہے اور نفسِ انسانی کا اس سے ایسا اُنس کہ "قُرَّۃُ عَیْنِی فِی الصَّلٰوۃِ"[2] کی کیفیت پیدا ہو سکے ناپید ہے۔ اس کے برعکس زیادہ ترقی پسند لوگوں کے نزدیک تو صلوٰۃ معاشرے کے ہم معنی قرار پائی ہے اور دوسروں کے نزدیک بھی اس کی اصل اہمیت اس حیثیت سے ہے کہ وہ مسلمان معاشرے کی اصلاح اور تنظیم کا ایک جامع پروگرام ہے! زکوٰۃ کا یہ پہلو کہ یہ روح کی بالیدگی اور تزکیئے کا ذریعہ ہے اس قدر معروف نہیں جتنی اس کی یہ حیثیت کہ یہ اسلامی نظامِ معیشت کا اہم ستون ہے۔ روزہ کے بارے میں یہ تو خوب بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ضبطِ نفس (SELF CONTROL) کی مشق و ریاضت ہے لیکن اس کی اس حقیقت کا یا تو سرے سے ادراک ہی نہیں ہے یا اس کے بیان میں حجاب محسوس ہوتا ہے کہ یہ رُوح کی تقویت کا سامان اور جسدِ حیوانی کی اس پر گرفت کو کمزور کرنے کا ذریعہ ہے چنانچہ یہ حدیث تو تحریر و تقریر میں عام بیان ہوتی ہے کہ "اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ"[3] اور اس کی تشریح پر خوب زور دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ حدیثِ قدسی کہ "الصّوم لی واَنَا اجزی بہٖ"[4] اوّل تو کم ہی بیان ہوتی ہے اور اگر ہوتی بھی ہے تو بس سرسری طور پر[5]۔ اسی طرح حج کے بارے میں یہ تو معلوم ہے کہ اس کے ذریعے "خدا پرستی کے محور پر ایک عالمگیر برادری" کی تنظیم ہوتی ہے لیکن اس سے آگے اس کی روحانی برکات کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔!

اسلام کی یہ نئی تعبیر براہِ راست نتیجہ ہے مغرب کے فلسفہ و فکر کے ہمہ گیر تسلّط کا جس

---

[1] حدیثِ نبویؐ ـــ "الصلوٰۃ معراجُ المؤمنین": نماز مومنوں کی معراج ہے! [2] حدیثِ نبویؐ: ـــ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے! [3] حدیثِ نبویؐ: ـــ "روزہ ڈھال کے مانند ہے" [4] حدیثِ قدسی "روزہ میرے لیے ہے میں خود اس کی جزا دوں گا" یا ایک دوسری قرأت کے مطابق! "روزہ میرے لیے ہے اور میں خود ہی اس کی جزا ہوں"۔ [5] واقعہ یہ ہے کہ اس حدیثِ قدسی کے صحیح مفہوم تک رسائی ایسے لوگوں کے بس میں ہے ہی نہیں جن کے دل و دماغ پر مادیّت کے پردے پڑے ہوتے ہیں!

نے نقطہ نظر کو ملحدانہ و مادّہ پرستانہ بنا کر رکھ دیا۔ نتیجتہً روح اور اس کی حیاتِ باطنی خارج از بحث ہو گئی۔ اور مادّہ اور حیاتِ دُنیوی ہی سارے غور و فکر کا موضوع اور سوچ بچار کا مرکز بنے۔ چنانچہ دین و مذہب کی بھی مادّی تعبیر ہوئی اور کہنے میں تو اگرچہ یہ آیا کہ اسلام فلاح انسانی کا جامع پروگرام ہے جس میں فلاح اخروی اور فلاح دنیوی دونوں شامل ہیں لیکن نگاہیں چونکہ فی الواقع صرف حیات دنیوی پر مرکوز ہیں لہٰذا آخری تجزیے میں اسلام ایک "سیاسی و عمرانی نظام" — (POLITICO -SOCIAL SYSTEM) بن کر رہ گیا — اور "الٰہیات" کی حیثیت ایک "پردے" سے زیادہ نہ رہی[1]! چنانچہ زندگی کا اصل مقصد یہ قرار پایا کہ اس نظامِ زندگی کو عملاً رائج و نافذ کیا جائے۔ رہی خدا کی معرفت و محبت اور اس کے سامنے تضرّع و اِخبات جو 'عبادت' کا اصل جوہر ہیں تو ان کی حیثیت بالکل ثانوی و اضافی ہو کر رہ گئی[2]۔

اس اعتبار سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں فی الواقع 'مذہبی' سے زیادہ 'سیاسی و عمرانی' اور 'دینی' سے زیادہ 'دنیوی' ہیں۔ اور آخری تجزیے میں دوسری سیاسی و معاشی تحریکوں سے صرف اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ اُن کے نزدیک سرمایہ دارانہ جمہوریت یا

---

[1] چنانچہ اس دَور کے ایک بہت بڑے متکلّم اور داعیٔ اسلام کا یہ فقرہ ایک ثقہ راوی نے روایت کیا کہ "اسلام دراصل ایک سیاسی و عمرانی نظام ہے جس پر الٰہیات کا پردہ ڈال دیا گیا ہے"۔ ع "چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است!"

[2] یہ صورت حال بھی خاصی قدامت پسند اسلامی تحریکوں کے یہاں ہے — ورنہ زیادہ ترقی پسند لوگوں نے تو فکرِ مغرب کی منطقی انتہا یعنی سوشلزم اور کمیونزم کے زیر اثر اسلام کو سیاسی و عمرانی سے بھی آگے بڑھ کر محض ایک معاشی پروگرام بنا کر رکھ دیا ہے یعنی ان کے نزدیک اسلام عبارت ہے محض ایک مخصوص "نظامِ ربوبیت" سے باقی رہے اعتقادات و ایمانیات تو اُن کے ضمن میں جہاں سرسیّد مرحوم کی انتہا ہوئی تھی وہاں سے انہوں نے ابتدا کی اور جنت و دوزخ کی تعبیر اسی دنیا کے عیش و آرام اور کلفت و مشقت سے اور قیامت کی تعبیر ایٹمی دھماکوں سے کر کے سارا معاملہ ہی ختم کر دیا۔ تاہم باوجود اس کے کہ ہماری نگاہ میں یہ بھی اسلام کی مادّی تعبیر ہی کی 'منطقی انتہا' ہے، مذہب کی یہ تعبیر ہمارا موضوع بحث نہیں اس لیے کہ چاہے اسے "قرآنی فکر" ہی کا نام کیوں نہ دیا گیا ہو اس کا خالص مادّی اور خلافِ قرآن ہونا اظہر من الشمس ہے اور ہم نے اس 'فکر' کی جانب کچھ اشارے کیے بھی ہیں تو محض ضمنی طور پر تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ دین و مذہب کی مادّی تعبیر کا سلسلہ بالآخر یہاں تک جاتا ہے ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج تا ثریّا مے رود دیوار کج !!!

اشتراکیت بہتر نظام ہائے حیات ہیں اور اِن کے نزدیک اسلام انسانی زندگی کے جملہ مسائل کو بہتر طور پر حل کرتا ہے ——— گویا درحقیقت مذہب کی اصل اقدار کے احیاء کا کام تو ابھی شروع بھی نہیں ہوا ؎

نہ مصطفےٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی کہ رُوحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی!

یہی سبب ہے کہ یہ تحریکیں بے لنگر کے جہازوں کے مانند اِدھر اُدھر بھٹک رہی ہیں اور ان کا حال اکثر و بیشتر اُس مسافر کا سا ہے جسے نہ تو منزل ہی کا پتہ رہا اور نہ یہ ہی یاد رہا کہ سفر شروع کہاں سے کیا تھا ؎

ہم تو فانی جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور و کفن غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

'احیائے اسلام' کی شرطِ لازم
'تجدیدِ ایمان'

اسلام کی بنیاد ایمان پر ہے اور احیائے اسلام کا خواب ایمان کی عمومی تجدید کے بغیر کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا! مسلمان ممالک کی سیاسی آزادی و خود اختیاری بھی یقیناً بہت اہم ہے اور اس سے بھی ایک حد تک اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی راہ ہموار ہوئی ہے اسی طرح اسلامی نظامِ زندگی کا تصوّر اور اس پر ایک بہتر نظامِ حیات ہونے کے اعتبار سے اعتماد بھی ایک حد تک مفید اور قابلِ قدر ہے اور جن تحریکوں کے ذریعے یہ پیدا ہوا یا ہو رہا ہے ان کی سعی و جہد بھی احیائے اسلام ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے لیکن اصل اور اہم تر کام ابھی باقی ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ عالمِ اسلام کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگ اس امر کی جانب متوجّہ ہوں اور جنہیں اس کی اہمیّت کا احساس ہو جائے وہ اپنی تمام تر سعی و جہد کو اس پر مرکوز کر دیں کہ امّت میں تجدیدِ ایمان کی ایک عظیم تحریک برپا ہو اور ایمان نرے اقرار اور محض قال سے بڑھ کر 'حال' کی صورت اختیار کرے!

ایمان لامحالہ کچھ ماوراء الطبعیاتی حقائق پر یقین کا نام ہے۔ اور اس راہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ انسان اُن دیکھی، حقیقتوں پر دکھائی دینے والی چیزوں سے زیادہ یقین رکھے اور سر کے کانوں سے سُنی جانے والی باتوں سے کہیں زیادہ اعتماد اُن باتوں پر کرے جو صرف دل کے کانوں سے سُنی جاسکتی ہیں۔ گویا "ایمان بالغیب" اس راہ کی شرطِ اوّلین ہے اور اس کے لیے فکر و نظر کا یہ انقلاب اور نقطہ نظر اور طرزِ فکر کی یہ تبدیلی لازمی و لابدی ہے کہ کائنات غیر حقیقی اور محض وہمی و خیالی نظر آئے لیکن ذاتِ خداوندی ایک زندۂ جاوید حقیقت معلوم ہو۔ کائنات کا پورا سلسلہ نہ از خود قائم معلوم ہو نہ کچھ لگے بندھے قوانین کے تابع چلتا نظر آئے بلکہ ہر آن و ہر سمت ارادۂ خداوندی و مشیّتِ ایزدی کی کارفرمائی محسوس و مشہود ہو جائے۔ مادّہ حقیر و بے وقعت نظر آئے لیکن روح ایک حقیقتِ کبریٰ معلوم ہو۔ انسان کا اطلاق اس کے جسد حیوانی پر نہ ہو بلکہ اس رُوحِ ربّانی پر کیا جائے جس کی بدولت وہ مسجودِ ملائک ہوا[1] ——— حیاتِ دنیوی فانی و ناپائیدار ہی نہیں بالکل غیر حقیقی و بے وقعت معلوم ہو اور حیاتِ اخروی ابدی و سرمدی اور حقیقی و واقعی نظر آنے لگے!! اور اللہ تعالےٰ کی رضا اور خوشنودی کے مقابلے میں دنیا و مافیہا کی وقعت حدیثِ نبوی صلّی اللہ علیہ وسلم کے مطابق مچھر کے پَر سے زیادہ محسوس نہ ہو! یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ جب تک اُمّت کے ایک قابلِ ذکر اور مؤثر حصّے میں نقطہ نظر کی یہ تبدیلی واقعۃً پیدا نہ ہو جائے "احیائے اسلام" کی آرزو ہرگز شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکے گی۔

عوام کی کشتِ قلوب میں ایمان کی تخم ریزی اور آبیاری کا مؤثر ترین ذریعہ ایسے اصحابِ علم و عمل کی صحبت ہے جن کے قلوب و اذہان معرفتِ ربّانی و نورِ ایمانی سے منوّر، سینے کبر، حسد، بُغض اور ریا سے پاک اور زندگیاں حرص، طمع، لالچ اور حُبِّ دنیا سے خالی نظر آئیں۔ خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ کے نظام کے درہم برہم ہو جانے کے بعد ایسے ہی نفوسِ قدسیہ

---

[1] آیۂ قرآنی: "فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَہٗ سٰجِدِیْنَ" ———
ترجمہ: جب میں اسے پوری طرح بنا چکوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو گر جانا اس کے لیے سجدے میں۔

کی تبلیغ و تعلیم، تلقین و نصیحت اور تربیت و صحبت کے ذریعے ایمان کی روشنی پھیلتی رہی ہے۔ اور اگرچہ جب سے مغرب کی الحاد و مادّہ پرستی کے زہر سے مسموم ہواؤں کا زور ہوا ایمان و یقین کے یہ بازار بھی بہت حد تک سرد پڑ گئے تاہم ابھی ایسی شخصیتیں بالکل ناپید نہیں ہوئیں جن کے "دلِ روشن" نورِ یقین اور "نفسِ گرم" حرارتِ ایمانی سے معمور ہیں۔ اور اب ضرورت اس کی ہے کہ ایمان و یقین کی ایک عام رَو ایسی چلے کہ قریہ قریہ اور بستی بستی ایسے صاحبِ عزیمت لوگ موجود ہوں جن کی زندگیوں کا مقصدِ وحید خدا کی رضا جوئی اور اس کی خوشنودی کا حصول ہو اور جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمانِ مبارک کے مطابق کہ لَاَنْ يَّهْدِيَ بِكَ اللّٰهُ رَجُلًا وَّاحِدًا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ[1] خلق کی ہدایت و رہنمائی کو زندگی کا واحد لائحۂ عمل قرار دے لیں۔ اور اس کے سوا ان کی زندگی میں کوئی اور تمنّا، آرزو یا حوصلہ و اُمنگ باقی نہ رہے۔

خوش قسمتی سے برصغیر ہند و پاک میں ایک وسیع پیمانے پر ایسی حرکت پیدا بھی ہو چکی ہے جس کے زیرِ اثر عوام میں ایمان کی روشنی پھیل رہی ہے اور کائنات سے زیادہ خالقِ کائنات مادّے سے زیادہ رُوح اور حیاتِ دنیوی سے زیادہ حیاتِ اُخروی کی اہمیّت کا احساس اجاگر ہو رہا ہے۔ ہماری مراد جماعتِ تبلیغی سے ہے جسے بجا طور پر تحریک دیوبند کی ایک شاخ قرار دیا جا سکتا ہے اور جس کی تاسیس کچھ ایسے اصحابِ ایمان و یقین کے ہاتھوں ہوئی ہے کہ آج ایک تہائی صدی[2] سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے باوجود اس کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آئی، اور اس کے باوجود کہ اس کے طریقِ کار سے ہم کلّیتہً اتفاق نہیں کرتے ہمارا مشاہدہ ہے کہ اس کے زیرِ اثر لوگوں کے طرزِ فکر اور نقطۂ نظر میں ایک ایسی عمومی تبدیلی واقعتہً پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں وہ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اصل حیثیّت کائنات کی نہیں خالقِ کائنات کی ہے اور اصل اہمیّت اسباب کی نہیں مسبّب الاسباب کی ہے۔ بھوک غذا سے

---

[1] حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: "اگر اللہ تعالےٰ تمہارے ذریعے کسی ایک انسان کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ بہتر ہے"

[2] اب اس تحریک کی عمر بھی نصف صدی سے تجاوز کر چکی ہے۔!

نہیں حکمِ خداوندی سے مٹتی ہے اور پیاس پانی سے نہیں اذنِ باری تعالےٰ سے بجھتی ہے! دین کے چھوٹے سے چھوٹے احکام انہیں کسی منطقی استدلال کی بنا پر یا کسی نظامِ زندگی کے اجزا یا اس کو قائم کرنے کے ذرائع کی حیثیت سے نہیں بلکہ فی نفسہٖ خیر نظر آنے لگتے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چھوٹی سے چھوٹی سنّتیں بجائے خود نورانی معلوم ہونے لگتی ہیں اور زندگی اور اس کے لوازمات کے باب میں کم از کم پر قناعت کر کے وہ اپنے اوقات کا معتدبہ حصّہ ایک مخصوص طریق پر تبلیغ و اشاعتِ دین کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔

لیکن چونکہ اس تحریک میں اصل تخاطب عقل سے نہیں جذبات سے ہے اور اس کی اصل اساس علم پر نہیں عمل پر ہے لہٰذا اس کے اثرات محدود ہیں اور معاشرے کے وہ طبقے جن کے یہاں جذبات پر عقل اور عمل پر علم کو اوّلیت حاصل ہے اس سے اثر پذیر نہیں ہوتے۔ ایسے لوگ اپنی ذہنی ساخت کی بنا پر مجبور ہوتے ہیں کہ عقل کی جملہ وادیاں طے کر کے عشق کی وادی میں قدم رکھیں اور خرد کی تمام گتھیاں سُلجھانے کے بعد صاحبِ جنون ہوں۔ پھر یہ بھی ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اسی قسم کے لوگ ہر دَور اور ہر معاشرے کی وہ ذہین اقلیّت (INTELLECTUAL MINORITY) ہوتے ہیں جو از خود معاشرے کی رہنمائی کے منصب پر فائز اور اجتماعیت کی پُوری باگ ڈور پر قابض ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی تبدیلی اور ان کے فکر و نظر کے انقلاب کو اوّلین اہمیّت حاصل ہے ——— اور اگر خدانخواستہ ایمان ان لوگوں کے دلوں میں جاگزیں نہ ہو سکا اور انہیں جہالت و جاہلیّت کی ظلمتوں سے نکالا نہ جا سکا تو صرف عوام النّاس کے قلوب و اذہان کی تبدیلی سے کسی مؤثر اور پائیدار تبدیلی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

کرنے کا اصل کام

بنا بریں وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ایک زبردست علمی تحریک ایسی اُٹھے

جو سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقات یعنی معاشرے کے ذہین ترین عناصر کے فکر و نظر میں انقلاب برپا کر دے ——— اور انہیں مادیّت و الحاد کے اندھیروں سے نکال کر ایمان و یقین کی روشنی میں لے آئے اور خدا پرستی و خود شناسی کی دولت سے مالا مال کر دے۔ خالص علمی سطح پر اسلامی اعتقادات کے مدلّل اثبات اور الحاد و مادّہ پرستی کے پُرزور ابطال کے بغیر اس مہم کا سر ہونا محال ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ چونکہ موجودہ دور میں فاصلے بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں اور پوری نوع انسانی ایک کنبے کی حیثیت اختیار کر چکی ہے لہٰذا علمی سطح کا تعیّن کسی ایک ملک کے اعتبار سے نہیں بلکہ پوری دنیا کے اعلیٰ ترین معیار کے مطابق کرنا ہوگا ——— اور اگرچہ یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ کام انتہائی کٹھن اور سخت محنت طلب ہے لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس کے بغیر اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے خواب دیکھنا جنت الحمقاء میں رہنے کے مترادف ہے۔

پیشِ نظر علمی تحریک کے لیے سب سے پہلے ایسے ذہین اور باصلاحیّت نوجوانوں کو تلاش کرنا ہوگا جن میں علم کی ایک شدید پیاس فطری طور پر موجود ہو، جن کے قلوب مضطرب اور روحیں بے چین ہوں، جن کو خود اپنے اندر یہ احساس موجود نظر آئے کہ اصل حقیقت حواس کی سرحدوں سے بہت پرے واقع ہے اور جن میں حقیقت کی تلاش و دریافت کا داعیہ اتنا شدید ہو جائے کہ وہ اس کے لیے زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہوں اور آرام و آسائش کے حصول اور خوشنما مستقبل (CAREERS) کی تعمیر سے یکسر بے نیاز ہو جائیں۔

ایسے نوجوانوں کو اوّلاً انسان کی آج تک کی سوچ بچار کا مکمّل جائزہ لینا ہوگا، اور اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ انسانی فکر کی پوری تاریخ کا گہرا مطالعہ کریں۔ اس اعتبار سے منطق، ماورا الطبیعات، نفسیات، اخلاقیات اور روحانیات ان کے مطالعہ اور غور و فکر کا اصل میدان ہوں گے۔ (اگرچہ ضمنی طور پر عمرانیات اور طبعیات کی ضروری معلومات کی تحصیل بھی ناگزیر ہوگی) فکرِ انسانی کے اس گہرے اور تحقیقی مطالعے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ

وحیِ آسمانی اور اس کے آخری جامع اور مکمل ایڈیشن یعنی قرآن حکیم کا گہرا مطالعہ حقیقت کی تلاش اور حقیقتِ نفس الامری کی دریافت کے نقطۂ نگاہ سے کریں۔

پھر اگر ایسا ہو کہ قرآن کی روشنی ان پر واضح ہو جائے، اس کا پیغام انہیں اپنی فطرت کی آواز معلوم ہو، اس کے نور سے ان کے قلوب و اذہان منوّر ہو جائیں، آفاق و انفس کی حقیقت و ماہیت کے بارے میں تمام بنیادی سوالوں کا تشفی بخش جواب انہیں مل جائے اور انبساطِ معرفت سے ان کے نفوس میں امن اور سکون و اطمینان کی کیفیّت پیدا ہو جائے، تو اسی کا نام ایمان ہے۔!

پھر یہی ہوں گے جنہیں "رسوخ فی العلم" حاصل ہو گا۔ جن کا علم ذہنی و اخلاقی آوارگی کے بجائے تقویٰ و خشیتِ الٰہی پر منتج ہو گا جن کی شخصیتیں اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا[1] کی مجسم تفسیر اور ع "قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن" کی عملی تصویر ہوں گے اس لیے کہ قرآن کا "مغز" دراصل یہی علمِ حقیقت، ہے جس کا دوسرا نام ایمان ہے۔ قانون و شریعت کی اہمیّت بجائے خود اگرچہ نہایت عظیم ہے لیکن اس کے مقابلے میں ان کی حیثیّت واقعۃً "استخوان" کی ہے[2]! ــــــ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کیفیتِ ایمانی کی تحصیل کے بغیر قرآن کے بیان کردہ قانون و شریعت پر غور و فکر بالکل بے کار ہے۔ یہی رمز ہے جو حضرت ابن عباسؓ کے اس قول میں بیان ہوا کہ تَعَلَّمْنَا الْاِيْمَانَ ثُمَّ تَعَلَّمْنَا الْقُرْاٰنَ[3]

مغرب کے فلسفہ و فکر کے مؤثر ابطال اور اس کی تہذیب و تمدّن کے واقعی استیصال کا کٹھن کام صرف ان لوگوں کے بس کا ہے جو "علمِ حقیقت" کے ان چشموں سے اچھی طرح سیراب

---

[1] آیت قرآنی: "اللہ کی خشیت اس کے اہلِ علم بندوں ہی کے دلوں میں گھر کرتی ہے۔"

[2] ما ز قرآں مغز ہا برداشتیم ۔ استخواں پیشِ سگاں انداختیم (رومی)

[3] ترجمہ: "ہم نے پہلے ایمان سیکھا اور پھر قرآن"

ہوں جو قرآن حکیم کی آیات بیّنات کی صورت میں رواں ہیں' ان ہی کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ آج کے فلاسفہ کے لیے ایک نئی "تہافت"[1] تصنیف کرسکیں اور آج کے منطقیّین پر از سرِ نو "رد"[2] کرسکیں' اور فی الجملہ الحاد و مادّہ پرستی کے اس سیلاب کا رُخ پھیر دیں جو تقریباً دو صدیوں سے ذہنِ انسانی کو بہائے لیے چلا جا رہا ہے۔

اس تخریب کے ساتھ انہیں جدید علم الکلام کی تاسیس کا 'مثبت' کام بھی کرنا ہوگا تاکہ ریاضی، طبعیات، فلکیات، حیاتیات اور نفسیات کے میدان میں جن حقائق کی دریافت آج تک ہوئی ہے[3] اور جو اسی حقیقت کلّی کی ادنیٰ جزئیات ہیں جن کا مظہر اتم ایمان ہے' انہیں اسلامی عقائد کے نظام میں اپنے اپنے مقام پر صحیح طور سے فٹ کیا جا سکے۔ آج سے پینتیس چالیس سال قبل علاّمہ اقبال مرحوم نے "الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید" کے سلسلے میں جو کام کیا تھا اس کا وہ حصّہ تو اگرچہ بہت محلّ نظر ہے جو شریعت و قانون اور اجماع و اجتہاد سے بحث کرتا ہے (اور جو فی الواقع "الٰہیات" سے براہ راست متعلق بھی نہیں ہے) تاہم اپنے اصل موضوع کے اعتبار سے علاّمہ مرحوم کی یہ کوشش بڑی فکر انگیز تھی اور جیسا کہ خود علاّمہ نے کتاب کے دیباچے میں فرمایا تھا کہ ــــــ "ہو سکتا ہے کہ جیسے جیسے علم آگے بڑھے اور فکر کی نئی راہیں کھلیں' زیرِ نظر کتاب میں جو خیالات بیان ہوئے ہیں، ان کے علاوہ بلکہ ان سے صحیح تر خیالات ظاہر ہوں۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم انسانی فکر کے ارتقاء کا ایک آزاد تنقیدی نقطۂ نگاہ سے مسلسل جائزہ لیتے رہیں ۔ ۔ ۔ ۔" اگر انہی خطوط پر کام جاری رہتا اور کچھ باہمّت لوگ اس کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیتے تو ایک بہت وقیع و قابل قدر کام ہو جاتا لیکن افسوس کہ خود علاّمہ مرحوم کے حلقۂ اثر میں سے بھی کسی نے اس میدان کو اپنی جولانیٔ طبع کے لیے منتخب نہیں کیا۔!

---

[1] تہافت الفلاسفہ۔ تالیف امام غزالیؒ

[2] الرّد علی المنطقیین۔ تالیف امام ابن تیمیہؒ

[3] واضح رہے کہ اس ضمن میں "حقائق" اور "نظریات" کے مابین فرق و امتیاز کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

بہرحال جب تک اس میدان میں واقعی قدر و قیمت رکھنے والا کام ایک قابلِ ذکر حد تک نہیں ہو جاتا یہ اُمید کہ معاشرے کے ذہین طبقات کو مذہب کی طرف راغب کیا جا سکے گا محض سراب کا درجہ رکھتی ہے ——!

"الٰہیات اسلامیہ کی تشکیلِ جدید" کے بعد دوسرا اہم کام یہ ہے کہ حیاتِ دُنیوی کے مختلف پہلوؤں یعنی سیاست و قانون اور معاشرت و معیشت کے باب میں اسلام کی ہدایت و رہنمائی کو مدلّل و مفصّل واضح کیا جائے۔ اس ضمن میں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے پچھلے پچاس ساٹھ سال کے عرصے میں خاصا کام مصر اور برِّصغیر ہند و پاک میں ہوا ہے خصوصاً جماعت اسلامی اور الاخوان المسلمون نے "اسلامی نظامِ حیات" اور "عدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام" کو تصنیف و تالیف کا مرکزی موضوع بنایا ہے تاہم اس سارے کام کو بس ایک اچھی ابتدا قرار دیا جا سکتا ہے اور اِدھر کچھ عرصہ سے مکھی پر مکھی مار دینے اور تقریباً ایک سی سطح اور ایک سے معیار کی تالیفات مختلف ناموں سے شائع کر دینے کا جو سلسلہ چل نکلا ہے اس نے بہت حد تک اس اساسی کام کی اہمیّت بھی ختم کر دی ہے جو بجائے خود خاصا قابلِ قدر تھا۔ اس ضمن میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ نیم خواندہ یا بقول مولانا اصلاحی "پڑھے کم لکھے زیادہ" لوگوں کی تصنیفات و تالیفات کی ایک خاص تکنیک کے ذریعے ایک مخصوص حلقے میں فروخت سے بعض لوگوں کا معاشی مسئلہ تو ضرور حل ہو سکتا ہے دین کی کوئی مثبت اور پائیدار خدمت ممکن نہیں ہے آج کی دنیا میں خصوصاً اعلیٰ ذہنی صلاحیتیں رکھنے والے لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ مسلّمہ علمی قابلیّت رکھنے والے لوگوں کے سوا کسی مؤلف و مصنف کی جانب التفات کر سکیں۔ لہٰذا لازم ہے کہ جو کام بھی کیا جائے وہ معیاری ہو اور کمیّت سے زیادہ کیفیت پیشِ نظر رہے۔

اس کام کے لیے بھی ظاہر ہے کہ ایک طرف موجودہ دنیا کے مسائل و معاملات کا صحیح فہم اور عمرانیات کے مختلف میدانوں میں جدید رجحانات کا براہِ راست علم ضروری ہے

اور دوسری طرف قرآن وسنّت میں گہری مہارت لازمی ہے اور جب تک یہ صورت نہ ہو کہ ان دونوں اطراف کا مطالعہ یکساں دِقّتِ نظر کے ساتھ کیا جائے معیاری نتائج کی توقع عبث ہے۔

عملی اقدامات

متذکرہ بالا علمی تحریک کے اجراء کے لیے فوری طور پر دو چیزیں لازمی ہیں۔

ایک یہ کہ عمومی دعوت و تبلیغ کا ایک ایسا ادارہ قائم ہو جو ایک طرف تو عوام کو تجدیدِ ایمان اور اصلاحِ اعمال کی دعوت دے اور جو لوگ اس کی جانب متوجہ ہوں ان کی ذہنی و فکری اور اخلاقی و عملی تربیّت کا بندوبست کرے[1] اور ساتھ ہی اس علمی کام کی اہمیّت ان لوگوں پر واضح کرے جو خلوص اور دردمندی کے ساتھ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے آرزومند ہیں اور دوسری طرف ایسے ذہین نوجوان تلاش کرے جو پیشِ نظر علمی کام کے لیے زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہوں۔ آج کے دَور میں، جبکہ مادّیت اور دنیا پرستی کا قلوب و اذہان پر مکمل تسلّط ہے اور کچھ تو فی الواقع طلبِ معاش کا مسئلہ اتنا کٹھن ہو گیا ہے کہ اکثر لوگوں کو اپنی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں اسی کے حل پر مرکوز کر دینی پڑتی ہیں، پھر معاشرے کا عام رجحان یہ ہو گیا ہے کہ جو ذرا اس سطح سے بلند ہوتا ہے اس پر معیارِ زندگی کو بلند تر کرنے کی دھن سوار ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے نوجوانوں کا ملنا بظاہر محال نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا سعید روحوں سے کبھی خالی نہیں ہوئی اور اگر کچھ مخلص و صاحبِ عزیمت لوگ ذہنی یکسوئی کے ساتھ اس کام کا بیڑا اٹھالیں تو انشاءاللہ اسی معاشرے میں بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک نوجوان ایسے مل جائیں گے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قولِ مبارک کو کہ خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ[2] اپنا لائحہ عمل بنا کر علمِ قرآن کی تحصیل و اشاعت کے لیے زندگی وقف کر دیں — یہ بھی واضح رہے کہ اصل ضرورت صرف اس کی ہوتی ہے کہ کسی جذبہ و خیال کے تحت انسان

---

[1] الحمدللہ کہ ان مقاصد کے لیے ۷۵ء میں "تنظیم اسلامی" کا قیام عمل میں آ گیا

[2] حدیثِ نبوی ؐ: — "تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھتے اور سکھاتے ہیں۔"

میں داخلی طور پر ایک داعیہ بیدار ہو جائے، پھر یہ داعیہ کام کی راہیں خود پیدا کر لیتا ہے اور تمام موانع و مشکلات سے خود نبٹ لیتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ اس خیال کو عام اور اس کی ضرورت کے احساس کو اُجاگر کیا جائے پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس اعلیٰ وارفع نصب العین کے لیے کام کرنے والے دستیاب نہ ہو سکیں۔

دوسرے یہ کہ ایک قرآن اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا جائے ——— جو ایک طرف علوم قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت کا بندوبست کرے تاکہ قرآن کا نور عام ہو اور اس کی عظمت لوگوں پر آشکارا ہو اور دوسری طرف ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے جو بیک وقت علوم جدیدہ سے بھی بہرہ ور ہوں اور قرآن کے علم و حکمت سے بھی براہ راست آگاہ ہوں تاکہ متذکرہ بالا علمی کاموں کے لیے راہ ہموار ہو سکے۔

علوم قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت کا اہم ترین نتیجہ یہ نکلے گا کہ عام لوگوں کی توجہات قرآن حکیم کی طرف مرکوز ہوں گی، ذہنوں پر اس کی عظمت کا نقش قائم ہو گا، دلوں میں اس کی محبت جاگزیں ہو گی اور اس کی جانب ایک عام التفات پیدا ہو گا۔ نتیجتاً بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان بھی اس سے متعارف ہوں گے اور کوئی وجہ نہیں کہ ان میں سے ایک اچھی بھلی تعداد ایسے نوجوانوں کی نہ نکل آئے جو اس کی قدر و قیمت سے اس درجہ آگاہ ہو جائیں کہ پوری زندگی کو اس کے علم و حکمت کی تحصیل اور نشر و اشاعت کے لیے وقف کر دیں۔ ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اس اکیڈمی کا اصل کام ہو گا، اور اس کے لیے ضروری ہو گا کہ ان کو پختہ بنیادوں پر عربی کی تعلیم دی جائے یہاں تک کہ ان میں زبان کا گہرا فہم اور اس کے ادب کا ستھرا ذوق پیدا ہو جائے۔ پھر انہیں پورا قرآن حکیم سبقاً سبقاً پڑھایا جائے، اور ساتھ ہی حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم دی جائے ——— پھر ان میں سے جو لوگ فلسفہ الٰہیات کا ذوق رکھنے والے ہوں گے، ان کے لیے ممکن ہو گا کہ وہ قرآن حکیم کی روشنی میں جدید فلسفیانہ رجحانات پر مدلل تنقید کریں اور جدید علم الکلام کی بنیاد رکھیں۔ اور جو عمرانیات کے مختلف

شعبوں کا ذوق رکھنے والے ہوں گے ان کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے اسلام کی رہنمائی و ہدایت کو اعلیٰ علمی سطح پر پیش کر سکیں۔

پس نوشت

صفحاتِ گزشتہ میں "قرآن اکیڈمی" کا جو خاکہ سامنے آیا وہ راقم کے قلم سے جون ۱۹۶۷ء میں نکلا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بالکل اسی نظریے اور خیال کے تحت اوّلاً ۱۹۱۴ء میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے "دارالارشاد" قائم کیا تھا۔ اور پھر ۱۹۳۷ء میں علامہ اقبال مرحوم کی تحریک پر "دارالاسلام" کی تاسیس ہوئی تھی۔

"دارالارشاد" کے بارے میں مولانا آزاد نے ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کے "البلاغ" میں جو شذرہ لکھا تھا اور "دارالاسلام" کے ضمن میں علامہ اقبال نے جو خط شیخ الازہر علامہ مصطفےٰ المراغی کو تحریر کیا تھا۔ ان کے اقتباسات اس صفحہ کی پشت پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ جن سے اس حیرت انگیز مماثلت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے جو ان تینوں تجویزوں کے مابین پائی جاتی ہے۔ لیکن افسوس کہ پیش نظر مقاصد کے لیے کوئی عملی پیش قدمی نہ "دارالارشاد" کے ذریعے ہو سکی نہ "دارالاسلام" کے۔ ان میں سے مقدّم الذکر کے بارے میں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کتنے عرصے قائم رہا اور کب ختم ہوا، اور اغلباً اس کے لیے کہیں کوئی اینٹ رکھنے کی نوبت بھی نہیں آئی، البتہ "دارالاسلام" کے نام سے ایک ادارہ باقاعدہ قائم ہوا۔ اس کے لیے ایک ٹرسٹ وجود میں آیا اور کچھ عمارات بھی ضلع گورداسپور میں پٹھانکوٹ کے قریب سرنار ریلوے سٹیشن سے متصل منصّہ شہود پر آ گئیں۔ جہاں اگست ۱۹۴۱ء سے اگست ۱۹۴۷ء تک غیر منقسم ہندوستان کی جماعتِ اسلامی کا مرکزی دفتر قائم رہا اور اس اعتبار سے یقیناً وہ عمارات ایک اعلیٰ مصرف میں آئیں لیکن ان مقاصد کے لیے براہِ راست کوئی پیش قدمی وہاں بھی نہ ہو سکی، جن کے لیے وہ ادارہ اصلاً قائم ہوا تھا۔

"دارالارشاد کا مقصد"

"چند سال پیشتر کا واقعہ ہے کہ مشیتِ الٰہی نے اس عاجز کی رہنمائی کی اور الہلال نے قرآن حکیم کی تبلیغ و دعوت کی صدا از سرِ نو بلند کی۔ لیکن اس عرصہ میں جو کچھ ہوا وہ ایک دعوتِ عام تھی جس کے ذریعے فہم و بصیرتِ قرآن کی نئی راہیں عوام و خواص نے اپنے سامنے دیکھیں اور قرآن کریم کی عشق و شیفتگی کا ایک نیا ولولہ دلوں میں پیدا ہو گیا۔ تاہم اس دعوت کی ایک دوسری منزل ابھی باقی ہے اور وہی فی الحقیقت اہم تر مقام سعی و تعب ہے یعنی قوم میں بجرت ایسے افراد پیدا کیے جائیں جو انہی راہوں پر چل کر قرآن حکیم کے علوم و معارف کو تحصیل حاصل کریں اور ان کے ذریعے قوم میں ارشاد و ہدایت اور احیائے دعوت و ذکر کا عملی سلسلہ بالعموم شروع ہو سکے۔

'دارالارشاد' کا مقصد یہی ہے کہ دعوت الی القرآن کی اس دوسری منزل کا سر و سامان ہو اور تھوڑے وقت اور بہت زیادہ صرفِ علم و فکر سے ایک ایسی جماعت پیدا کی جائے جو قرآن حکیم کی دعوت و تبلیغ کی خدمت اور اصلاح و ارشادِ اُمت کا فرض انجام دے سکے۔"

(البلاغ : ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء)

"دارالاسلام" کا مقصد

"ہم نے ارادہ کیا ہے کہ علوم جدیدہ کے چند فارغ التحصیل حضرات اور علوم دینیہ کے چند ماہرین کو یہاں جمع کریں۔ یہ ایسے حضرات ہوں جن میں اعلیٰ درجے کی ذہنی صلاحیتیں ہوں اور ان کی رہنمائی کے لیے ہم ایک ایسا معلّم جو کامل اور صالح ہو اور قرآن حکیم میں مہارت تامہ رکھتا ہو نیز انقلابِ دورِ حاضرہ سے بھی واقف ہو، مقرر کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان کو کتاب اللہ اور سنّتِ رسُول اللہ کی رُوح سے واقف کرے اور تفکرِ اسلامی کی تجدید یعنی فلسفہ، حکمت، اخلاق، سیاسیات و اقتصادیات کے علوم میں ان کی مدد کرے تاکہ وہ اپنے علم اور تحریروں کے ذریعے تمدنِ اسلامی کے دوبارہ زندہ کرنے کے لیے جہاد کر سکیں۔"

(بحوالہ "اقبال' دارالاسلام اور مودودی" صفحہ ۸۲)

باب دوم

فکرِ مغرب کی اساس

اور اس کا تاریخی پس منظر

از

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

مرحوم

پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور کا مندرجہ ذیل مضمون بظاہر تو ایک خط ہے جو موصوف نے راقم الحروف کے اس مضمون کی تحسین اور تائید کے لیے لکھا تھا جو جون ۱۹۶۷ء کے 'میثاق' میں 'تذکرہ و تبصرہ' کے عنوان کے تحت شائع ہوا تھا لیکن اس نے یورپ کے فلسفہ و فکر کے تاریخی ارتقاء کے موضوع پر ایک جامع اور مبسوط مقالے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انتہائی اختصار اور کمال جامعیت کے امتزاج کے اعتبار سے یہ تحریر اپنی مثال آپ ہے۔ کاش کہ پروفیسر صاحب کی بعض دوسری ناگزیر مصروفیات نے موصوف کو مہلت دی ہوتی اور وہ اس موضوع پر زیادہ تفصیل سے لکھ سکتے تو فلسفۂ جدید کے طالب علموں کی رہنمائی کا ایک مستقل سامان ہو جاتا۔ بحالتِ موجودہ بھی ہمیں یقین ہے کہ یہ تحریر فلسفۂ جدید کے بہت سے طالب علموں کے لیے انتہائی مفید ثابت ہوگی۔

پروفیسر صاحب کی یہ تحریر بھی اولاً 'میثاق' کی دسمبر ۶۷ء اور جنوری ۶۸ء کی اشاعتوں میں شائع ہوئی تھی۔ بعد ازاں جب وہ مقالہ 'دارالاشاعت الاسلامیہ' کے تحت "اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام" کے عنوان سے شائع ہوا تو پروفیسر صاحب کی اس تحریر کو بھی اس کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم و مغفور نے 'صدقِ جدید' کی اشاعت بابت ۷، فروری ۱۹۶۹ء میں تحریر فرمایا تھا۔

"دونوں مقالے ماہنامہ 'میثاق' لاہور میں قسط وار نکل چکے ہیں۔ دونوں کا موضوع نام سے ظاہر ہے، دونوں فکر انگیز ہیں۔ اور ایک طرف جوش و اخلاص اور دوسری طرف دانش و باریک بینی کے مظہر ہیں۔ مرض کی تشخیص اور تدبیر علاج دونوں میں دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے۔ رسالہ ہر پڑھے لکھے کے ہاتھ میں جانے کے قابل ہے۔"

خاکسار

اسرار احمد

برادرِ عزیزم السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

میثاق ماہ جون ۶۷ء میں جو خیالات آپ نے تحتِ "تذکرہ وتبصرہ" سپردِ قلم کیے ہیں
کو پڑھ کر خوشی بھی ہوئی اور آپ کے لیے تہِ دل سے دُعا بھی نکلی۔ آپ نے عصرِ حاضر پر
تبصرہ کیا ہے وہ صحیح ہے۔ اہلِ مغرب کا ملحدانہ زاویۂ نگاہ، اس زاویۂ نگاہ کا اہلِ مشرق کے
ذہنوں پر تسلّط، اس کے مُضر نتائج، اس ناگوار صورتِ حال سے رہائی کی تجویز اور اصلاحِ حال
کی راہ۔ اِن مباحث پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ بلاشبہ آپ کی اصابتِ فکر ورائے، معاملہ فہمی،
ژرف نگاہی اور حقائق رسی کا واضح ثبوت ہے۔ مَیں آپ کو صدقِ دل سے مبارکباد دیتا ہوں کہ
اللہ تعالیٰ نے آپ کو جوانی میں بوڑھوں کی سی سمجھ عطا فرمائی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ
نے مسلمانوں کی دینی اصلاح کی کسی خدمت کے لیے آپ کو منتخب کرلیا ہے اور مَیں دعا کرتا ہوں
کہ اللہ آپ کو خدمتِ دین کی بیش از بیش توفیق بھی عطا فرمائے۔

مَیں نے بھی نصفِ صدی تک (از ۱۹۱۷ء تا ایندم) انہی دو تین مسائل پر غور کیا ہے۔
یعنی مغرب میں الحاد اور مادّیت کے فروغ کے اسباب، ان مغربی افکار کا اقوامِ مشرق کے
ذہنوں پر تسلّط اور اس تسلّط سے رہائی کی صورت۔ مجھے آپ کا مضمون پڑھ کر جو غیر معمولی مسرّت
حاصل ہوئی ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ میرے نتائجِ افکار اور آپ کے نتائجِ افکار میں
حیرت انگیز مطابقت پائی جاتی ہے۔ میری رائے میں آپ کی خدمت میں ہدیۂ تحسین پیش
کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ مَیں آپ کے بعض دعاوی کو مبرہن اور مدلّل کر دوں، بعض
حقائق کی وضاحت کر دوں، بعض صداقتوں کو مؤکد کر دوں اور بعض تجاویز کو مشیّد کر دوں۔

۱۔ آپ نے لکھا ہے:

"موجودہ دَور بجا طور پر مغربی فلسفہ وفکر اور علوم وفنون کی بالادستی کا دَور ہے
اور آج پورے کرۂ ارض پر مغربی افکار ونظریات اور انسان اور کائنات
کے بارے میں وہ تصوّرات پوری طرح چھائے ہوئے ہیں جن کی ابتدا۔

آج سے دوسو سال قبل یورپ میں ہوئی تھی" نیز یہ کہ "مغربی تہذیب وتمدّن اور فلسفہ وفکر کا یہ تسلّط بہت شدید اور ہمہ گیر ہے"

آپ کا یہ تبصرہ بالکل صحیح ہے چنانچہ میرے اور علّامہ اقبالؒ دونوں کے معنوی لسان العصر اکبر الٰہ آبادی نے آج سے پچاس سال پہلے انہی حقائق کو اپنے مخصوص ظ انداز میں یوں بیان کر دیا تھا:۔

مرزا غریب چُپ ہیں ان کی کتاب ردّی
بُڈّھوا کڑ رہے ہیں" صاحب نے یہ کہا ہے"

اور:۔
چیز وہ ہے بنے جو یورپ میں
بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے

۲۔ آپ نے لکھا ہے:۔

" لیکن اس پورے ذہنی اور فکری سفر کے دوران ایک نقطۂ نظر جو مسلسل پختہ ہوتا چلا گیا اور جسے بجا طور پر اس پورے فکر کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں خیالی اور ماورائی تصوّرات کے بجائے ٹھوس حقائق کو غور وفکر کا اصل مرکز ہونے کی حیثیّت حاصل ہے اور خدا کے بجائے کائنات، رُوح کے بجائے مادّہ اور موت کے بعد کسی زندگی کے تصوّر کے بجائے حیاتِ دنیوی کو اصل موضوع بحث قرار دیا گیا ہے۔"

یہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے، حرف بحرف صحیح ہے۔ آج مغرب شدید نوعیّت کا اور انکارِ خدا کی لعنت میں گرفتار ہے چنانچہ آج مغرب میں منطقی ایجابیت (LOGICAL POSITIVISM) کا فلسفہ سب سے زیادہ مقبول ہے اور اس کے علاوہ جو مدارسِ فکر مقبول ہیں وہ بھی سب سب انکارِ خدا اور رُوح و آخرت پر مبنی ہیں اور خالص مادّیت کے حامی اور مبلّغ ہیں۔ مثلاً:

(ا) THE PHILOSOPHY OF AS IF جس کا سب سے پُر جوش حامی اور وکیل VAIHINGER
(ب) PHENOMENALISM 〃 〃 〃 〃 HUSSREL
(ج) DIALECTICAL MATERIALISM جس کا سب سے پُر جوش حامی اور وکیل ہے MARX

(د)	NATURALISM	جس کا سب سے پُرجوش حامی اور وکیل ہے	SANTAYANA
(ہ)	AGNOSTICISM AND SCEPTICISM	〃 〃 〃 〃	J. S. MILL
(و)	EMERGENT EVOLUTION	〃 〃 〃 〃	LOYD MORGAN
(ز)	ATHEISM	〃 〃 〃 〃	MORRIS COHEN
(ح)	HUMANISM	〃 〃 〃 〃	SCHILLER
(ط)	REALISM	〃 〃 〃 〃	MOORE
(ی)	PRAGMATISM	〃 〃 〃 〃	DEWY
(ک)	LOGICAL EMPIRICISM	〃 〃 〃 〃	CARNAP
(ل)	EXISTENTIALISM	〃 〃 〃 〃	JEAN P.SRTRE
(م)	FREUDISM	〃 〃 〃 〃	FREUD
(ن)	BEHAVIOURISM	〃 〃 〃 〃	ADLER
(س)	COMMUNISM	〃 〃 〃 〃	LENIN
(ع)	SOCIALISM	〃 〃 〃 〃	LASKI
(ف)	LOGICAL ATOMISM	〃 〃 〃 〃	RUSSELL
(ص)	PHYSICAL REALISM	〃 〃 〃 〃	SELLARS

اِن تمام مدارسِ فکر میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ جو شئے حواسِ خمسہ سے محسوس نہ ہو اس کے وجود پر یقین کرنا سراسر حماقت ہے۔ چونکہ خدا، رُوح اور حیات بعد الموت تینوں غیر محسوس ہیں، اس لیے ان کی ہستی پر یقین خلافِ عقل ہے بلکہ یہ تینوں الفاظ مہمل ہیں کیونکہ ان کے مصادیق خارج میں کہیں موجود نہیں ہیں۔

یورپ میں لامذہبیت اور انکارِ خدا کے اسباب کی داستان بہت طویل ہے۔ جن حضرات کو اس موضوع سے دلچسپی ہو انہیں حسبِ ذیل کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے:-

1. CONFLICT BETWEEN RELIGION & SCIENCE
   By DR. DRAPER.

2. HISTORY OF THE INTELLECTUAL DEVELOPMENT OF EUROPE By DR. DRAPER.

3. HISTORY OF THE WARFARE BETWEEN SCIENCE AND THEOLOGY By WHITE

4. HISTORY OF EUROPEAN MORALS By DR. LECKY

5. HISTORY OF FREE THOUGHT IN EUROPE By ROBERTSON

تاہم قارئین کی خاطر ذیل میں اجمالی طور پر کچھ اشارات درج کیے دیتا ہوں۔

(ا) جب JUSTINIAN قیصر روم نے یہ دیکھا کہ حکمائے یونان نصرانیت کے خلاف عقل عقائد پر فلسفیانہ اعتراضات کرتے رہتے ہیں تو اس نے تنگ آکر ۵۲۹ء میں اپنی قلمرو میں فلسفہ اور حکمت کی تعلیم کو ممنوع قرار دے دیا اور تمام فلاسفہ اور حکما کو جلاوطن کر دیا۔

(ب) اغیار کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد نصرانیوں کی زبان بندی اور ذہنی غلامی کے لیے کلیسائے روم کے اساقفِ اعظم (POPES) نے یہ قانون نافذ کیا کہ جو عیسائی کسی مذہبی عقیدے یا کسی کلیسائی فرمان پر اعتراض کرے گا، اسے کلیسا سے بھی خارج کر دیا جائے گا اور ملعون قرار دے دیا جائے گا۔ یعنی جیتے جی اچھوت اور بعد وفات اس کا لاشہ بے گور و کفن!

(ج) اجانب اور اقارب دونوں کی طرف سے بے فکر ہو جانے کے بعد کلیسائے روم کے خلافِ عقل عقائد[1] (DOGMAS) کے ساتھ حسب ذیل احکام واجب الاذعان بھی نافذ کر دیئے:

ا۔ معیارِ حق و باطل بائبل نہیں ہے بلکہ کلیسا ہے اور کلیسا سے مراد ہے پوپ اور اس کے

---

[1] مثلاً (ا) تثلیث جس کی رُو سے خدا بیک وقت و بیک جہت (باقی اگلے صفحے کے نیچے)

ماتحت مذہبی پیشواؤں کی جماعت۔

۲۔ ہر پوپ معصوم عن الخطا اور مطاع ہے اس لیے اس کے احکام میں چون وچرا کی گنجائش نہیں ہے۔

۳۔ مذہب اور مذہبی عقائد میں عقل کو مطلق دخل نہیں ہے۔

بجا کہے جسے پاپا، اسے بجا سمجھو
زبانِ پوپ کو نقارۂ خدا سمجھو!

۴۔ کلیسائی روایات کا انکار بھی کفر ہے۔

۵۔ پوپ اور کلیسا کو گناہ معاف کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

۶۔ کلیسا کے علاوہ کسی شخص کو بائبل لکھنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

(۵) تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں اُندلس کے مشہور فلسفی ابنِ رشد (متوفی ۱۱۹۸ء) کی تمام تصانیف کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوگیا اور پندرہویں صدی میں اس کی تمام

وبیک حیثیت وہ یک اعتبار ایک بھی ہے اور تین بھی ہے نیز وحدت بھی حقیقی ہے اور تثلیث بھی حقیقی ہے۔

(ب) تجسّم جس کی رُو سے کلام (LOGOS) جو خدا کے ساتھ بھی ہے اور خدا بھی ہے مجسّم ہوکر یسوع کی شکل میں ظاہر ہوا۔

(ج) یسوع نے اگرچہ وہ خدا تھا اور خدا کی صورت میں تھا، بوجہ غایت فروتنی (HUMILITTY) اپنے آپ کو الوہیت سے معرّیٰ کر دیا اور غلام کی حیثیت اختیار کر لی اور صلیبی موت گوارا کر لی۔

(د) یسوع مسیح نے مصلوب ہوکر قیامت تک پیدا ہونیوالے انسانوں کے پیدائشی گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔

(ہ) جب پادری، عشاء ربانی کے وقت روٹی اور شراب پر یسوع کا نام لے کر دعا کرتا ہے اور اسے اپنے ہاتھ سے متبرک کر دیتا ہے تو وہ روٹی یسوع کا جسم اور شراب، یسوع کا خون بن جاتی ہے۔ اس ناقابلِ فہم عمل کو اصطلاح میں (TRANSUBSTANTIATION) کہتے ہیں۔ اُردو میں اس کا ترجمہ ہوگا استحالۂ جوہری یا انقلابِ ذات۔

تصانیف اٹلی اور فرانس کی یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں شامل ہوگئیں۔ ان تصانیف کی بدولت یورپ ایک ہزار سال کے بعد ارسطو کے فلسفے سے واقف ہوا اور اس کی وجہ سے یورپ میں سولہویں صدی میں دو تحریکیں رونما ہوئیں جن کا نام "احیاء العلوم" اور "اصلاحِ کلیسا" ہے۔ چنانچہ رومن کیتھولک کلیسا، جس کے خلاف لوتھر نے صدائے احتجاج بلند کی اس بات کی معترف ہے کہ لوتھر بڑی حد تک ابن رشد کے فلسفے سے متأثر ہوا تھا میری تحقیق بھی یہی ہے کہ لوتھر کے دماغ میں کلیسا کی اصلاح کا خیال ابن رشد کی تصانیف کے مطالعے سے پیدا ہوا تھا۔

قصہ مختصر سولہویں صدی میں حسب ذیل پادریوں نے جو رومی کلیسا سے وابستہ تھے، کلیسا کی چیرہ دستیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی: ERASMUS م ۱۵۳۶ء، ZIVINCLI م ۱۵۳۱ء LUTHER، م ۱۵۴۶ء، MCLANCTHON، م ۱۵۶۱ء اور CALVIN م ۱۵۶۴ء۔ ان کا سربراہ لوتھر تھا اس نے یہ اعلان کیا کہ بائبل کی صداقت کا دارومدار کلیسا پر نہیں ہے (جیسا کہ کلیسا کہتی تھی)، بلکہ خود کلیسا کی صداقت کا دارومدار بائبل پر ہے یعنی معیارِ حق و صداقت بائبل ہے نہ کہ پوپ یا کلیسا۔

لوتھر اور اس کے ہمنواؤں کے احتجاج (PROTEST) کا نتیجہ یہ نکلا کہ رومن کیتھولک مذہب کے مقابلے میں یورپ میں پراٹسٹنٹ مذہب پیدا ہوگیا اور کلیسا کا اقتدار بڑی حد تک ختم ہوگیا۔

تحریک احیاء العلوم کی بدولت یورپ میں فلسفے (خصوصاً فلسفۂ ارسطو) کے مطالعے کا ذوق از سرِ نو زندہ ہوگیا اور جب اس کی بدولت یورپ کو عقلی آزادی نصیب ہوئی تو سترھویں صدی میں سائنس کا دور شروع ہوا جو آجکل بیسویں صدی میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا ہوا ہے۔

(۵) اہل سائنس اور اہل فلسفہ دونوں نے کلیسائیت اور نصرانیت کے خلافِ عقل عقائد پر اعتراضات وارد کیے۔ کلیسا اور نصرانیت دونوں ان کے جوابات سے قاصر اور عاجز تھیں۔ اس لیے انہوں نے معترضین کو کلیسا اور مذہب دونوں سے خارج کر دیا۔

کلیسا سے دوسری غلطی یہ ہوئی کہ اس نے سائنس کی تحقیقات کو بھی مذہب کے خلاف قرار

دے دیا مثلاً جب کاپرنیکس اور گلیلیو نے یہ کہا کہ زمین گول ہے اور آفتاب کے گرد گھوم رہی ہے تو کلیسا نے کہا یہ باتیں مذہب کے خلاف ہیں اور ان کے قائلین کافر ہیں۔

(و) کلیسا کی عقل دشمنی کا نتیجہ یہ نکلا کہ سائنس اور مذہب میں جنگ شروع ہوگئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکماء اور فلاسفہ نے مذہب کو خیرباد کہہ دیا اور اس طرح یورپ میں لامذہبیت کا آغاز ہوگیا۔

اٹھارہویں صدی کے نصفِ اوّل میں (HUME) نے لاادریت کا فلسفہ پیش کیا اور عقلی دلائل سے ثابت کیا کہ عقلِ انسانی، خدا کی ہستی کا اثبات نہیں کرسکتی۔ ہیوم کے اس فلسفے کو کانٹ (KANT) نے ۱۷۸۱ء میں پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا اور اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "تنقیدِ عقلِ خالص" میں خدا کی ہستی پر جو دلائل فلاسفہ نے مدوّن کیے تھے، ان سب کا ابطال کر دیا، اور اس طرح انکارِ خدا کی راہ ہموار کر دی۔

انیسویں صدی میں مشہور منطقی سر ولیم ہیملٹن اور مشہور عالمِ الٰہیات ڈاکٹر مینسل نے ہیوم اور کانٹ کے نظریات کی یہ کہہ کر مزید تائید کر دی کہ ذہنِ انسانی خدا کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتا۔ ان کے بعد مل اور اسپنسر نے اپنے فلسفۂ لاادریت سے مذکورہ بالا حکماء کے نظریات کو تقویت پہنچائی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انکارِ خدا کا عقیدہ خواص اور عوام دونوں کے دماغوں میں جاگزیں ہوگیا۔

جب یورپ کو کلیسا اور پوپ کی غلامی سے نجات ملی تو حکماء اور فلاسفہ نے نفسِ مذہب کے ساتھ ساتھ نصرانیت اور کلیسائی عقائد کو بھی ہدفِ تنقید بنایا اور انیسویں صدی میں ان کی تنقید اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گئی۔ چنانچہ اس صدی کے نصفِ اوّل میں مشہور جرمن فاضل اور محقق اسٹراس (STRAUSS - 1808 - 1874) نے ۱۸۳۵ء میں حیاتِ یسوع (LEBA N JESU) لکھ کر کلیسا کے ایوان میں زلزلہ ڈال دیا۔ اس غیر فانی کتاب میں اس نے اس بات کو مبرہن کیا کہ یسوع کی شخصیت تاریخی طور پر ثابت نہیں ہوسکتی نیز یہ کہ یسوع تو قدیم دیوتا متھرا کا مثنّٰی ہے اور جو مذہب اس کے نام سے منسوب ہے وہ متھرائیت کا چربہ ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر واکر پروفیسر تاریخِ کلیسا نے اپنی تصنیف تاریخِ کلیسا میں اس

کتاب کو THE MOST EPOCH MAKING BOOK (عظیم ترین عہد آفریں کتاب) قرار دیا ہے۔

۱۸۴۱ء میں ہیگل کے مشہور شاگرد فیورباخ (م ۱۸۷۲ء) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "THE ESSENCE OF CHRISTIANITY" شائع کی جس میں اس نے عیسائی مذہب اور اس کے تصوّرِ ذاتِ باری دونوں کا ابطال کر دیا۔

۱۸۶۳ء میں فرنچ فاضل ارنسٹ رینان (م ۱۸۹۲ء) نے حیاتِ یسوع (VIE DE JESUS) لکھی جس میں اس نے یہ ثابت کیا کہ یسوع محض ایک انسان تھا۔

پروفیسر بَور (F. C. BAUR) نے بائبل کی کتابوں پر تنقید کی اور ثابت کیا کہ پولوس کے خطوط میں سے صرف تین اصلی ہیں باقی سب جعلی ہیں اس لیے بائبل بحیثیت مجموعی قابلِ اعتماد نہیں ہے۔

(ن) میں نے بخوفِ طوالت چند نقادوں کے تذکرے پر اکتفا کیا ہے۔ میرا مقصد یہ دکھانا ہے کہ اس تنقید کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پہلے مذہب عیسوی اور اس کے بعد نفس مذہب بھی پایۂ اعتبار سے ساقط ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہب کو اس بات سے بھی بہت ضعف پہنچا، کہ یورپ میں جو فلسفہ —— اور اس سے میری مراد فلسفۂ تصوّریت (IDEALISM) ہے، مذہب کا حامی تھا، انیسویں صدی میں اس پر چاروں طرف سے اعتراضات شروع ہو گئے اور اس کے زوال کا نتیجہ یہ نکلا کہ فلسفے کے میدان میں مذہب کا کوئی مددگار باقی نہ رہا۔ اس کی تفصیل یہ ہے:۔

انیسویں صدی میں کارل مارکس نے اپنے فلسفۂ اشتراکیت کو مسلکِ مادیت کی اساس پر قائم کیا جو خدا اور روح دونوں کا منکر ہے۔

ڈارون نے نظریۂ ارتقاء پیش کیا جس سے مسلکِ مادیت کو تقویت حاصل ہوئی، شوپن ہاور نے نظریۂ قنوطیت (PESSIMISM) کی اشاعت کی اور یہ نظریہ بھی خدا اور مذہب کا مخالف ہے۔

مِل اور اسپنسر نے مسلکِ لاادریت کی تبلیغ کی اور یہ مسلک بھی مذہب اور خدا کے بارے میں شکوک پیدا کرتا ہے۔

نطشہ (NEITZCHE) نے بھی اپنے فلسفے میں خدا کا انکار کیا اور 'ANTI CHRIST' لکھ کر عیسائیت پر کاری ضرب لگائی۔

بیسویں صدی میں وجودیت (EXISTENTIALISM) اور منطقی اثباتیت (LOGICAL POSITIVISM) نے مادّیت کو تقویت پہنچائی اور جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں آج یورپ میں آخر الذکر فلسفہ سب سے زیادہ مقبول ہے۔ جس کی رُو سے خدا، رُوح اور آخرت تینوں الفاظ قطعاً مہمل اور بے معنی ہیں۔

یہ سچ ہے کہ بریڈلے (م ۱۹۲۴ء) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "مظاہر اور حقیقت" "APPEARANCE & REALITY" میں مادّیت کی پورے طور سے تردید کر دی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر ریشڈل نے اپنی تصنیف "فلسفہ اور مذہب" میں میرے قول کی بایں الفاظ تائید کی ہے: "مسٹر بریڈلے نے اپنی تصنیف کے ابتدائی ابواب میں مادّیت کے مقابلے میں تصوّریت کی جس انداز سے حمایت کی ہے اس کی تردید نہیں ہو سکتی۔" (ص۲۷) لیکن یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ عصرِ حاضر میں الحاد پرور سائنس اور ملحدانہ مدارسِ فلسفہ کو جو قبول عام کی سند حاصل ہو گئی ہے اس کی وجہ سے فلسفۂ تصوّریت جو مادّے کے مقابلے میں رُوح کو اصل کائنات اور حقیقتِ اقصیٰ قرار دیتا ہے۔ غیر مقبول ہو چکا ہے۔ آج کی دنیا میں حکماء اور فلاسفہ کی اکثریت کا میلان مادّیت کی طرف ہے اور مذہب کی اپیل بہت کمزور ہو گئی ہے اور سائنٹیفک نظریات نے بہت سے مذاہب کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا ہے۔

عصرِ حاضر میں پانچ مدارسِ فکر بہت مقبول ہیں۔ اور سب کے سب الحاد پرور ہیں۔ اور انکارِ خدا اور رُوح پر مبنی ہیں یعنی:۔

1. PLURALISTIC REALISM.
2. DIALECTICAL MATERIALISM.
3. EXISTENTIALISM.
4. NATURALISM.
5. LOGICAL POSITIVISM.

اوران میں آخر الذکر فلسفہ سب سے زیادہ مقبول ہے۔

خلاصۂ کلام یا رجحانِ عصرِ حاضر قصّہ مختصر خدا اور مذہب کے بارے میں جو شکوک اور شبہات جدید تعلیم یافتہ طبقے کے افراد میں پائے جاتے ہیں، ان کے اسباب یہ ہیں :-

(ا) سائنٹیفک اسپرٹ (روح) کی روز افزوں نشوونما اور آبیاری۔
(ب) ٹیکنولاجیکل تہذیب کی ترقی۔
(ج) مادّی علوم وفنون کا عروج۔
(د) ایجادات کی بدولت تسخیرِ عناصرِ کائنات کا سلسلہ۔
(ہ) لذّاتِ جسمانی اور ترغیباتِ جنسی کی روز افزوں فراوانی اور بوقلمی۔

ان عناصر سے انسان کا نقطۂ نظر سراسر مادّی ہوگیا ہے اور اس کا اثر حیات کے ہر شعبے پر مرتب ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنسی فتوحات نے انسان کی نگاہوں کو خیرہ کردیا ہے[1]

خدا سے بے نیازی کی ابتدا، تو کاپرنیکس ہی کے عہد سے شروع ہوچکی تھی اسی لیے لاپلاس (LAPLACE م ۱۸۲۷ء) نے نپولین کے سوال کے جواب میں یہ عہد آفریں جواب دیا تھا کہ "میں نے اپنی تصنیف 'توضیحِ نظامِ کائنات' میں خدا کا ذکر محض اس لیے نہیں کیا کہ عقل کی مدد سے کائنات کا نظام خدا کے بغیر بھی مدّون ہوسکتا ہے"۔ اور اسی لیے بیسویں صدی میں اقبال کے استاد میک ٹیگرٹ[2] (م ۱۹۲۵ء) نے جب اپنا فلسفۂ خودی "ONTOLOGICAL IDEALISM" کے عسیر الفہم عنوان سے مرتب کیا تو انسانی خودی کو حقیقت (REALITY) تسلیم کرنے کے بعد خدا کو اپنے نظامِ فکر سے بکلّی خارج کردیا۔

فزیکل سائنس ہر لمحے ہماری حیاتِ اجتماعی و انفرادی کو متأثر کرتا ہے۔ خصوصاً ہمارے

---

[1] نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی　　یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے (اقبال)

[2] اقبال نے ۱۹۲۵ء میں اپنے استاد کے سوانح حیات پڑھ کر اس کی یاد میں ایک مختصر سا مضمون لکھا تھا اور اس کے آغاز میں اسے PHILOSOPHER SAINT "فلسفی ولی" کے لقب سے نوازا تھا۔

مدارسِ فلسفہ ہمارے مذاہب اور حیات و ممات سے متعلق ہمارے عمومی زاویۂ نگاہ پر تو نمایاں اور قابلِ تردید اثر مرتب ہوا ہے۔

جدید سائنس کی رُو سے حیاتِ عضوی کی توجیہہ محسوس فطری قوانین کی روشنی میں کی جاتی ہے۔ اس کے لیے کسی فوق الفطرت طاقت کا سہارا نہیں لیا جاتا اور اس سائنٹیفک توجیہہ کی رُو سے انسان فاعلِ مختار (FREE MORAL AGENT) نہیں ہے۔

اسی طرح جدید نفسیات کی رُو سے انسان اپنی ذات کا مالک نہیں ہے۔ نفسِ انسانی کی باشعور زندگی پر اس کی حیوانی جبلّتوں کی حکومت ہے جو اس کے لاشعور میں پوشیدہ ہیں۔ فرائڈ یہ بھی کہتا ہے کہ ارادہ و مشیّت کی آزادی دراصل ایک خود پسندانہ فریبِ نفس ہے۔ انسانی شخصیّت کا تعیّن خارجی ماحول سے ہوتا ہے۔ جیسا ماحول مل گیا ویسا ہی انسان بن گیا۔

فلسفۂ اخلاق بھی سراسر مادّی بنیادوں پر استوار کر دیا گیا ہے۔ پروفیسر ڈیوی لکھتا ہے کہ "اخلاقی اقدار بھی اُسی طرح غیر مستقل اور بے ثبات ہیں جس طرح بادل۔ مستقل (ازلی) اقدار کا تصوّر محض خوش فہمی ہے"۔ رہے مسائلِ مابعد الطبیعات تو ان کے متعلق منطقی اثباتیت (LOGICAL POSITIVISM) کا فتویٰ یہ ہے کہ جو شے حواسِ خمسہ سے محسوس نہ ہو وہ ناقابلِ التفات ہے۔ کائنات اور حیاتِ انسانی کے بارے میں سائنس اور فلسفۂ مادّیت کا قولِ فیصل یہ ہے کہ یہ دونوں بے مقصد ہیں۔ انسان کی تقدیر یہ ہے کہ وہ پیدا ہو، کھائے پیئے، افزائشِ نسل کرے اور آخر کار مر کر ہمیشہ کے لیے فنا (معدوم) ہو جائے۔ الغرض جدید سائنس اور فلسفے کی روح، مذہب کے خلاف ہے۔

یہ ہے مختصر طور پر آپ کے مضمون کے ابتدائی حصّے کی توضیح۔ میں نے اختصار کو مدِّنظر رکھا ہے ورنہ یہ موضوع اس قدر وسیع الذّیل ہے کہ اس پر ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

پھر آپ نے لکھا ہے کہ "اس قسم کی کوشش کا مظہرِ اتمّ برصغیر میں دارالعلوم دیوبند تھا جو کہنے کو تو صرف ایک درس گاہ تھا لیکن واقعتہً اس کی حیثیّت ایک عظیم تحریک سے کسی طرح کم نہ تھی نیز یہ کہ "یہ امر واقعی ہے کہ اُن (سرسیّد) کی ان کوششوں سے دین و مذہب کی جان نکل گئی اور مادّہ پرستانہ ذہنیت کے تحت مذہب کا ایک لامذہبی ایڈیشن تیار ہوا"۔ میں آپ کے اخذ کردہ نتائج

سے بالکل متفق ہوں۔ سر سیّد نے مذہب کے درخت میں مغربی فلسفے کا جو پیوند لگایا ہے، اس کے اثمارِ تلخ سے پاکستانی مسلمانوں کے کام و دہن بقدرِ ذوق خوب لذّت اندوز ہو رہے ہیں۔ "دقیانوسی" ٹائپ کے مسلمان ابھی سے اس تلخی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں۔ انہیں کون بتائے کہ ؎

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھنا ہوتا ہے کیا

پھر آپ نے لکھا ہے کہ "اِن تحریکوں کا مطالعۂ اسلام اسی مغربی مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر پر مبنی ہے جس میں روح پر مادّے کو اور حیاتِ اُخروی پر حیاتِ دنیوی کو فوقیّت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اقرار تو موجود ہے لیکن ایمان باللہ کی وہ کیفیت کہ انفس اور آفاق میں تنہا وہی فاعلِ مطلق، مؤثّرِ حقیقی اور مسبّب الاسباب نظر آنے لگے، بالکل مفقود ہے۔ ۔ ۔ رسالت کا اقرار تو موجود ہے لیکن محبتِ رسولؐ نام کو موجود نہیں ہے۔

میں آپ سے بالکل متفق ہوں اور آپ کو اس حقائق رسی، ژرف نگاہی اور معرفت نگاری پر داد دیتا ہوں۔ سچّی بات یہی ہے کہ جب تک ایک مسلمان، اللہ تعالیٰ کو فاعلِ حقیقی اور مؤثّرِ حقیقی نہ سمجھے وہ قرآنی توحید کے مقام پر فائز نہیں ہو سکتا۔ اسلامی تصوّف، جسے جاہل صوفیوں نے بدنام کر دیا، دراصل توحید ہی کو دل و دماغ میں جاگزیں کرنے اور اسے زندگی میں ایک عاملِ مؤثّر بنانے اور اس کے تقاضوں پر عمل کے لیے آمادہ کرنے کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ[1] اپنی تصنیف "فتوح الغیب" کے تیسرے مقالے میں فرماتے ہیں کہ "اے بیٹے اس بات کو حرزِ جاں بنا لے کہ لافاعلَ فی الحقیقۃِ ولامؤثّرَ فی الحقیقۃِ الّا اللہ" ——

—— واحسرتا! آج شیخ موصوفؒ کے نام پر گیارہویں کی

---

[1] شیخ موصوف ۴۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ بیس سال کی عمر میں دینی علوم سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد بیس سال تک اپنے مرشد کے زیرِ تربیت رہ کر تزکیۂ نفس کرتے رہے۔ چالیس سال کی عمر میں مرشد کے حکم سے تلقین و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور پچاس سال تک مسلمانوں کو توحید کا درس دیتے رہے اور طالبانِ حق کی رہنمائی کرتے رہے۔ ۵۶۱ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ ع رحمتِ ایزدی بر روحش باد!

نیاز کرنے والے تو لاکھوں ہیں مگر ان کی تعلیم پر عمل کرنے والا ایک بھی نظر نہیں آتا کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ جس بزرگ نے پچاس برس تک مسلمانوں کو یہ تلقین کی ہو کہ اللہ کے سوا کوئی دستگیر نہیں، کوئی مشکل کشا نہیں، کوئی حاجت روا نہیں، آج اس کے نام لیوا خود اسی کو دستگیر اور مشکل کشا سمجھتے ہیں اور اللہ کے بجائے اسی کو پکارتے ہیں۔

پھر آپ نے لکھا ہے کہ "ضرورت اس امر کی ہے کہ اُمّت میں تجدید ایمان کی ایک عظیم تحریک برپا ہو تاکہ ایمان زبانی اقرار اور محض قال سے بڑھ کر 'حال' کی صورت اختیار کرلے۔"

میں اس باب میں آپ سے بکلّی متفق ہوں۔ اقبالؔ نے اسی بات کو یوں ظاہر کیا ہے بالفاظِ دگر انہوں نے بھی یہی علاج تجویز کیا ہے:

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

صحابۂ کرامؓ کی زندگیوں میں ہمیں یہی انقلاب نظر آتا ہے کہ عقیدۂ توحید ان کا حال بن گیا تھا اسی انقلاب کا یہ نتیجہ تھا کہ "انہیں یہ کائنات غیر حقیقی اور محض وہمی اور خیالی نظر آتی تھی لیکن ذاتِ خداوندی ایک زندۂ جاوید حقیقت معلوم ہوتی تھی۔" وہ جس طرف کو منہ کرتے تھے انہیں اللہ ہی نظر آتا تھا اور وہ ہر واقعے میں اللہ ہی کو کارفرما دیکھتے تھے۔ اکبر الہ آبادی نے ذیل کے شعر میں یہی اندازِ نگاہ پیدا کرنے کی تلقین کی ہے:

ارشاد ہے کہ شرک نہ کر اور نماز پڑھ
مطلب تجھ سے کسی کو نہ دیکھ اور ہمیں کو دیکھ

پھر آپ نے لکھا ہے کہ "ایمان بالغیب کے لیے نقطۂ نظر اور طرزِ فکر کی تبدیلی لازمی ہے کہ کائنات غیر حقیقی اور محض وہمی و خیالی نظر آئے لیکن ذاتِ خداوندی ایک زندۂ جاوید حقیقت معلوم ہو۔۔۔ حیاتِ دنیوی فانی ہی نہیں بالکل غیر حقیقی اور بے وقعت معلوم ہو اور حیاتِ اُخروی حقیقی اور واقعی نظر آنے لگے جب تک اُمّت کے ایک قابلِ ذکر حصّے میں نقطۂ نظر کی یہ تبدیلی رونما نہ ہو احیائے اسلام کی آرزو ہرگز ہرگز شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکے گی۔" میں آپ کی اس بات سے بکلی اتفاق کرتا ہوں بلکہ میری دلی آرزو یہ ہے کہ اللہ آپ کو توفیق دے کہ آپ اس صداقتِ عظمیٰ کو پاکستان ہی نہیں

تمام دنیائے اسلام میں شائع کر سکیں اور ہر مسلمان تک پہنچا سکیں۔ میں پچاس برس کے غور و فکر کے بعد جس نتیجے پر پہنچا، اللہ نے آپ کو دس پندرہ سال کے غور و فکر کے بعد اسی نتیجے پر پہنچا دیا اور مزید کرم یہ کیا کہ اسے پیش کرنے کی سعادت بھی آپ کو عطا فرمائی۔

بیسویں صدی میں مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے لیے جو تحریکیں ہندوستان اور دوسرے اسلامی ملکوں میں برپا ہوئیں وہ سب میری نگاہوں کے سامنے ہیں اور میں نے اپنی آنکھوں سے ان تحریکوں کو ناکام ہوتے دیکھا ہے۔ سبب اس ناکامی کا وہی ہے جو آپ نے بیان کیا ہے کہ جن لوگوں نے یہ تحریکیں برپا کیں ان میں بنیادی نقص یہ تھا کہ اللہ کے ساتھ ان کا تعلق محض قال تک محدود تھا بالفاظ دگر وہ اسلام کا نام تو لیتے تھے، مگر اس کی روح سے بیگانہ تھے۔ اسلام کی رُوح، جیسا کہ میں سمجھا ہوں محض ارکانِ اسلام کی رسمی پابندی نہیں ہے بلکہ دل کی آنکھوں سے اللہ عزّ و جلّ کا مشاہدہ یا اُس ذاتِ پاک کے ساتھ ایسا شدید قلبی رابطہ ہے جو مسلمان کو اس مقام پر پہنچا دے جہاں پہنچ کر ہر وقت اللہ ہی پیشِ نظر رہتا ہے، غیر اللہ کی ہستی کالعدم ہو جاتی ہے۔

پھر آپ نے لکھا ہے "عوام کے قلوب میں ایمان کی تخم ریزی اور آبیاری کا مؤثر ترین ذریعہ ایسے اصحابِ علم و عمل کی صحبت ہے جن کے قلوب اور اذہان معرفتِ ربّانی سے منوّر ہوں اور سینے کبر و حسد، بغض و ریا سے پاک ہوں اور زندگیاں حرص و طمع اور حُبِّ دنیا سے خالی ہوں"۔

میں اس معاملے میں بھی آپ سے بکلّی متفق ہوں، ازراہِ تفاخر نہیں بلکہ بطورِ اظہارِ حقیقت یہ بات لکھ رہا ہوں کہ میں نے پچاس سال سے زائد عرصہ منطق، فلسفہ، الٰہیات اور علم کلام کے مطالعے میں ضائع کیا لیکن خدا گواہ ہے کہ نہ تو ان علوم و فنون سے اللہ کے ساتھ تعلق پیدا ہوا اور نہ کتابوں سے کبر و حسد، بغض و ریا اور حرص و طمع کا ازالہ ہوا۔ ان امراضِ خبیثہ کا ازالہ تو کیا ہوتا الٹا میرا دماغ شکوک و شبہات کی جولانگاہ بن گیا اور اگر اس عالمِ پیری میں (سن ولادت ۱۳۱۳ھ) توفیقِ ایزدی تصوّف کے نخلستان میں نہ پہنچا دیتی تو آج تشکیک کے ریگستان میں العطش العطش پکارتا ہوتا۔ شکر ہے کہ وفات سے پہلے یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہو گئی کہ ؎

نہ کتابوں سے، نہ کالج سے، نہ زر سے پیدا
دیں ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا (اکبرؒ)

سچ کہا ہے شیخ سعدیؒ نے:

جز یادِ دوست ہرچہ کنی عمر ضائع ہست — جز حرفِ عشق ہرچہ بخوانی بطالت است
سعدی بشوئے نقشِ دوئی راز لوحِ دل — علمے کہ راہِ حق نہ نماید، جہالت است

نیز سچ کہا ہے مرشد رومیؒ نے:

علم چہ بود؟ آنکہ رہ بنمایدت — زنگِ گمراہی زدل بزدایدت
علم نبود غیرِ علمِ عاشقی — مابقی، تلبیسِ ابلیسِ شقی

یہ صحبت ہی کا تو ثمرہ تھا کہ ابن ابی قحافہ، صدّیق اکبرؓ کے مقام پر فائز ہو گئے اور یہ صحبت ہی کا تو کرشمہ تھا کہ ابن خطّاب کو فاروق اعظمؓ کا مرتبہ حاصل ہو گیا۔ رضی اللہ عنہما۔ اسی لیے اقبال نے یہ کہا:

صحبت از علمِ کتابی خوشتر است
صحبتِ مردانِ حر، آدم گر است
دیں مجو اندر کتب اے بے خبر
علم و حکمت از کتب، دیں از نظر

پھر آپ نے لکھا ہے کہ "وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ایک زبردست علمی تحریک اٹھے جو تعلیم یافتہ طبقات اور ذہین افراد میں انقلاب برپا کر دے یعنی انہیں خدا پرستی اور خود شناسی کی دولت سے مالا مال کر دے۔۔۔ الخ"

میں آپ کی ان تجاویز سے بکلّی متفق ہوں اور اس دعا پر اس خط کو ختم کرتا ہوں کہ اللہ آپ کو عصرِ حاضر میں دعوت و تبلیغِ اسلام کی توفیق ارزانی فرمائے اور یہ حقیقت آپ پر واضح کر دے کہ مقصدِ حیات استرضاءِ باری تعالیٰ ہے نہ کہ حصولِ حکومتِ ارضی۔ حکومت یا خلافت، ایمان و عمل صالح کا ثمرہ ہے نہ کہ مقصود بالذّات شے۔ اور آپ سے استدعا ہے کہ آپ اس ننگِ خلائق کے خاتمہ بالخیر کی دعا فرمائیں:

وقتِ طلوع دیکھا، وقتِ غروب دیکھا
اب فکرِ آخرت ہے، دنیا کو خوب دیکھا (اکبرؒ)

والسّلام خیر الختام
مجمع عیوب و زشتی یوسف سلیم چشتی

حصّہ دوم

دعوت رجوع الی القرآن

کا تاریخی پس منظر

قرآنِ حکیم قرنِ اوّل میں اور اُس کے بعد

اسلام برِعظیم پاک و ہند میں

ترجمہ و تفسیرِ قرآن کے مختلف مکاتبِ فکر

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کا موسّس

واقعہ یہ ہے کہ بدءُ الاسلام میں دین کی اصل اساسی اور بنیادی حقیقتیں دو ہی تھیں — ایک قرآنِ حکیم جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی جدّوجہد کے ضمن میں 'آلۂ انقلاب' کی حیثیت حاصل ہے بقول مولانا حالی ؎

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اور دوسرے جہاد فی سبیل اللہ جو جامع عنوان ہے آپؐ کی اس جدّوجہد کے مختلف مدارج و مراحل کا۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ قرآن مجید ہی کی گرج اور کڑک تھی جس نے نیند کے ماتوں کو جگایا اور خوابِ خرگوش کے مزے لوٹنے والوں کو بیدار کیا۔ چنانچہ "وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝" اور "اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝" کی چونکا دینے والی صدائیں اور "اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝" اور "اَلْحَآقَّةُ ۝ مَا الْحَآقَّةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ۝" کی بیدار کن ندائیں ہی تھیں جنہوں نے پورے عرب میں ہلچل مچادی اور "عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ ۝ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ ۝ الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝" کی کیفیت پیدا کر دی۔ بقول مولانا حالی ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی عرب کی زمیں جس نے ساری ہلادی

پھر — اسی کی آیات بیّنات تھیں جنہوں نے هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖٓ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۝ (الحدید: ۹) کے مصداق انسانوں کو شرک، الحاد، مادہ پرستی، حُبِّ عاجلہ، اور حیوانیّتِ محضہ کے "ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" ایسے مہیب اور ہولناک اندھیروں سے نکال کر ایمان اور یقین کی روشنی سے بہرہ ور فرمایا۔ چنانچہ وہ ایک طرف عرفانِ الٰہی اور محبّتِ خداوندی سے سرشار یعنی مستِ بادۂ الست ہو گئے اور دوسری طرف دنیا و مافیہا ان کی نگاہوں میں مچھر کے پَر سے بھی حقیر تر ہو گئے اور وہ کُلّیۃً طالبِ عقبیٰ بن گئے

مزید برآں ——— وہی تھا جو "مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ" بھی بن کر آیا، اور "شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ" بھی! چنانچہ اُسی کے ذریعے لوگوں کا تزکیۂ نفس بھی ہوا اور تصفیۂ قلب و تجلیۂ روح بھی!

گویا انذار ہو یا تبشیر، تبلیغ ہو یا تذکیر، موعظت ہو یا نصیحت، تعلیم ہو یا تربیت، تزکیہ ہو یا تصفیہ، تجلیہ ہو یا تنویر ——— الغرض تطہیر ہو یا تعمیر مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پُورا عملِ دعوت و اصلاح قرآن مجید ہی کے گرد گھومتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں ایک نہ دو پورے چار مقامات پر آنحضورؐ کے منہجِ انقلاب کو جن اساسی اصطلاحات کے ذریعے واضح کیا گیا ہے اُن کا اوّل و آخر خود قرآن مجید ہی ہے۔ بفحوائے الفاظ قرآنی:

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ	سناتا ہے انہیں اُس کی آیات اور
يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ	پاک کرتا ہے ان کو اور سکھاتا ہے انہیں
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ: ۲)	کتاب اور حکمت!

قرآن کا کارنامہ، ایک جملے میں بیان کیجیے، تو یہ ہے کہ اس نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے دلوں میں ایمان پیدا کر دیا اور توحید، معاد اور رسالت پر یقینِ محکم کی کیفیت پیدا کر دی لیکن اِس سے اُس ہمہ گیر تبدیلی کا اندازہ نہیں ہوتا جو قرآنِ حکیم کے بدولت اُن کی زندگیوں میں برپا ہو گئی تھی اِس لیے کہ قرآن نے اُنؓ کا فکر بدلا، سوچ بدلی، نقطۂ نظر بدلا، اقدار بدلیں، عزائم بدلے، امنگیں بدلیں، شوق بدلے، دل چسپیاں بدلیں، خوف بدلے، اُمیدیں بدلیں، اخلاق بدلے، کردار بدلے، خلوت بدلی، جلوت بدلی، انفرادیت بدلی، اجتماعیت بدلی، دن بدلا، رات بدلی حتیٰ کہ "تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ" کے مصداق آسمان بدلا، زمین بدلی، الغرض پُوری کائنات بدل کر رکھ دی ——— اور اِس پوری تبدیلی کا ذریعہ اور آلہ ہیں قرآنِ حکیم کی آیاتِ بیّنات! بقول علامہ اقبالؒ:

بندۂ مومن ز آیاتِ خداست	ایں جہاں اندر برِ او چوں قباست!
چوں کہن گردد جہانے در برش	می دہد قرآں جہانِ دیگرش!

تبدیلی اگر حقیقی اور واقعی ہو تو اُس کی کوکھ سے لازماً تصادم اور کشمکش جنم لیتے ہیں جن کے مراحل تبدیلی کی نوعیت اور مقدار کی نسبت سے کم و بیش ہو سکتے ہیں۔ ایمان نے جو تبدیلی صحابہ کرامؓ میں پیدا کی اُس نے جس تصادم اور کشمکش کو جنم دیا اُس کے جملہ مدارج و مراحل کا جامع عنوان ہے 'جہاد فی سبیل اللہ'۔

اِس تصادُم اور کشمکش کا اوّلین ظہور انسانوں کی اپنی شخصیت کے داخلی میدانِ کارزار میں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ 'مجاہدہ مع النفس' کو 'افضل الجہاد' قرار دیا گیا[1] پھر جب ایمان اشخاص کے باطن میں اس طرح راسخ اور مستولی ہو گیا کہ ریب اور تشکّک کے کانٹے نکل گئے تو اب اُسی جہاد و مجاہدہ کا ظہور عالمِ خارجی میں ظالموں، سرکشوں اور خدا کے باغیوں سے کشمکش اور تصادُم کی صُورت میں ہوا جس کا مقصد قرار پایا 'تکبیرِ ربّ'[2] یعنی اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اقرار و اعلان اور اس کی حاکمیّت مطلقہ کا بالفعل قیام و نفاذ تاکہ "اُس کی مرضی جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو!"[3] ——— اور اِس کی آخری منزل ہے "قتال فی سبیل اللہ" جس کا منتہائے مقصود معیّن ہوا ان الفاظ میں کہ:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ	اور جنگ کرتے رہو اُن سے یہاں تک
فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ	کہ "فتنہ" بالکل فرو ہو جائے اور اطاعت
كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ (الانفال: ۳۹)	کُلّیۃً اللہ ہی کی ہونے لگے!

ایمان و یقین اور جہاد و قتال کا یہی وہ لزومِ باہمی ہے جس کو نہایت واضح اور دو ٹوک الفاظ میں بیان کیا گیا قرآنِ حکیم کی اس آیۂ مبارکہ میں:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ	مومن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ
وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا	پر اور اُس کے رسولؐ پر پھر شک میں
وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ	نہ پڑے اور جہاد کرتے رہے اللہ کی راہ میں
اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ	اور کھپاتے رہے اس میں اپنے اموال
هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۔ (الحجرات: ۱۵)	اور اپنی جانیں حقیقت میں یہی ہیں سچے!

---

[1] آنحضورؐ سے دریافت کیا گیا "اَیُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ" تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: "اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ!"

[2] الفاظِ قرآنی کی رُو سے "وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ○" (المدّثر: ۳) اور بقول علّامہ اقبالؒ

یا وُسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل — یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مسلکِ مردانِ خود آگاہ خدا مست — یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

[3] سیدنا مسیح علیہ السلام کے الفاظ۔

واضح رہے کہ اس آیۂ مبارکہ کے اوّل و آخر حصر کا اسلوب بھی ہے اور آیۂ ماقبل میں 'حقیقی ایمان' اور 'قانونی اسلام' کے مابین فرق و امتیاز کا مضمون بھی۔ گویا مومنِ صادق کی جامع و مانع تعریف قرآنِ حکیم کی کسی ایک آیت میں مطلوب ہو تو وہ یہی آیت ہے۔

الغرض قرآن کے اصل حاصل ہیں ایمان اور یقین اور اُن کا لازمی نتیجہ ہیں جہاد اور قتال۔ اِن میں سے ایمان و یقین اصلاً ایک معنوی حقیقت اور داخلی کیفیّت کا نام ہیں، چنانچہ عالمِ خارجی میں اسلام کی دو عظیم ترین اور نمایاں ترین حقیقتیں ہیں قرآن اور جہاد۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں ایمانِ حقیقی کی مستقل علامتوں (SYMBOLS) کی حیثیّت رکھتے ہیں اور مردِ مومن کی شخصیت کا جو ہیُولیٰ تخیّل اور تصوّر میں اُبھرتا ہے اُس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لازمی و لابُدی ہیں!

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیّبہ اور خلافتِ راشدہ کے دَوران اسلام کی 'نشأۃِ اُولیٰ' یا غلبۂ دینِ حق کا دَورِ اوّل بلا شائبۂ ریب و شک نتیجہ تھا صحابۂ کرامؓ کے تعلّق قرآن اور جذبۂ جہاد کا۔ لیکن یہ بھی ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں کہ جیسے ہی اسلام نے ایک مملکت اور سلطنت کی صورت اختیار کی اِن دونوں کی حیثیّت ثانوی ہو کر رہ گئی۔ اور ایسا ہونا ایک حد تک منطقی اور فطری بھی تھا۔ اس لیے کہ ایک طرف تو کسی مملکت یا سلطنت میں اوّلین و اہم ترین مسئلہ شہریّت کا ہوتا ہے جو ایک خالص قانونی مسئلہ ہے جس میں تمام تر بحث انسان کے 'ظاہر' سے ہوتی ہے، باطن سے کوئی سروکار ہی نہیں ہوتا گویا بقول علامہ اقبال ؒ "بندوں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا!" —— مزید برآں اس کا اصل موضوع نظم و نسق اور امن و امان کا ہوتا ہے جس کے اعتبار سے بنیادی اہمیّت قانون اور ضابطے کو حاصل ہوتی ہے نہ مکارمِ اخلاق یا مواعظِ حَسَنہ کو۔ حتّٰی کہ اس اعتبار سے قصاص عفو پر مقدّم ہو جاتا ہے —— اور دوسری طرف سلطنتوں اور مملکتوں کو، خواہ وہ اصولی اور نظریاتی ہی ہوں اصل سروکار اپنی حفاظت و مدافعت سے ہوتا ہے، اصُولوں اور نظریات کی تبلیغ و اشاعت ہوتی بھی ہے تو ثانوی درجے میں اور حکومتوں کی مصلحتوں کے تابع رہ کر!

یہی وجہ ہے کہ جب اسلام مملکت اور سلطنت کے دَور میں داخل ہوا تو اصل زور (EMPHASIS) ایمان کے بجائے اسلام پر، یقین کے بجائے اقرار اور شہادت پر اور باطن سے بڑھ کر ظاہر پر ہو گیا۔ نتیجتہً قرآنِ حکیم کے بھی منبعِ ایمان اور سرچشمۂ یقین ہونے کی حیثیّت مؤخر اور نگاہوں سے اوجھل ہوتی

چلی گئی اور کتاب قانون اور بحیثے ازادلۂ اربعہ[1] ہونے کی حیثیت مقدم اور مرکزِ توجہ بنتی چلی گئی۔ اور پھر جیسے جیسے مملکت اور سلطنت کے تقاضے پھیلتے گئے اور قانون کی عملداری وسیع ہوتی گئی قرآن مجید تو 'چار میں کے ایک' کی حیثیت میں پس منظر میں گم[2] ہوتا چلا گیا اور توجہات حدیث اور فقہ پر مرتکز ہو کر رہ گئیں[3]۔ ستم بالائے ستم یہ کہ علم اور حکمت کے میدان میں جو خلا اس طرح پیدا ہوا اُسے پُر کرنے کے لیے مصر و یونان کی جانب سے فلسفہ و منطق کی آندھیاں آئیں۔ نتیجۃً پورا عالمِ اسلام ارسطو کی منطق اور نوافلاطونی تصوّف کی آماجگاہ بن کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ فلسفہ و اصُولِ اخلاق کے لیے بھی مسلمانوں کو اغیار کے سامنے کاسۂ گدائی پیش کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا[4]! اور رفتہ رفتہ صورت یہ ہو گئی کہ قرآن نہ منبعِ ایمان رہا نہ سرچشمۂ یقین اور نہ مخزنِ اخلاق رہا نہ معدنِ حکمت ——— بلکہ صرف ایک ایسی کتاب مقدس' بن کر رہ گیا جس کے الفاظ یا تو حصُولِ برکت اور ایصالِ ثواب کا ذریعہ بن سکتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کے کام آسکتے ہیں[5]۔ اور اس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی کہ ایک زمانہ وہ آئے گا کہ:

لَا یَبْقَیٰ مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا	اسلام میں سے سوائے اُس کے نام کے اور کچھ
اِسْمُہٗ وَلَا یَبْقَیٰ مِنَ الْقُرْاٰنِ	باقی نہ رہے گا اور قرآن میں سے سوائے
اِلَّا رَسْمُہٗ (مشکوٰۃ: کتاب العلم)	صورتِ الفاظ کے اور کچھ نہ بچے گا۔

بعینہٖ یہی معاملہ 'جہاد' کے ساتھ بھی ہوا، جب اصل زور ایمان پر نہ رہا بلکہ اسلام پر ہو گیا تو جہاد بھی جو ایمانِ حقیقی کا رُکنِ رکین تھا خود بخود نگاہوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا۔ اور ساری توجہ ارکان

---

[1] اصول شریعت چار ہیں: قرآن[1]، سُنّتِ رسول[2]، قیاس[3]، اجماع[4] انہیں اَدِلّۂ اَربعہ کہا جاتا ہے۔

[2] حضرت اکبر کا بہت پیارا شعر ہے۔

صَوم ہے ایمان سے، ایمان غائب صَوم گم — قوم ہے قرآن سے قرآن رخصت قوم گم!

[3] چنانچہ اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ پر تو بے شمار تصانیف ملتی ہیں لیکن اصول تفسیر کے موضوع پر چودہ سو سال میں کل دو[2] رسالے ملتے ہیں ایک امام ابن تیمیہ کا رسالہ 'اصُولِ تفسیر' اور دوسرا امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی کا رسالہ 'الفوز الکبیر'

[4] اسی کا مرثیہ کہا مولانا رومؒ نے ان الفاظ میں ؎

چند خوانی حکمتِ یونانیاں — حکمتِ قرآنیم را ہم بخواں

[5] ایک تیسرا مصرف قرآن کا وہ ہے جو علامہ اقبالؒ نے اس شعر میں بیان کیا: ؎

بآیاتش ترا کارے جزیں نیست — کہ از یاسینِ او آساں بمیری

اسلام پر منحصر ہو گئی جن کی فہرست میں جہاد سرے سے شامل ہی نہیں ہے، گویا جہاد پر ظلم قرآن سے بھی بڑھ کر ہوا۔ اس لیے کہ قرآن تو خواہ چار میں کے ایک کی حیثیت ہی سے سہی بہر حال شریعت کے اصول اربعہ میں شامل تو ہے، جہاد تو نہ صرف یہ کہ اسلام کے ارکانِ خمسہ میں شامل نہیں بلکہ نظامِ فقہ میں بھی اس کی حیثیت فرضِ عین کی نہیں صرف فرضِ کفایہ کی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ جہاد کا تصور بھی مسخ ہو گیا اور اس شجرۂ طیبہ کی شاخوں کو جڑ اور تنے سے جدا کر کے ہر ایک کو مختلف رنگ دے دیا گیا چنانچہ ایک طرف جہاد مع النفس کا رُخ اعمال اور معاملات کی منجدھار سے پرے ہی پرے اذکار و اوراد اور نفسیاتی ریاضتوں اور ورزشوں کی راہِ یسیر (SHORT CUT) کے جانب موڑ دیا گیا اور دوسری طرف جہاد کو قتال کے ہم معنیٰ قرار دے کر اس کا مقصد مملکت کی سرحدوں کے تحفظ و دفاع اور بس چلے تو توسیع کے سوا کچھ نہ رہا۔ رہا شرک و ظلم، کفر و فسق اور زُور و منکر کی ہر صورت کے ساتھ مسلسل کشمکش اور تصادم اور حق و صداقت کے پرچار، نیکی اور راستبازی کی ترویج، کلمۂ توحید کی نشر و اشاعت اور دینِ حق کے غلبہ و اقامت کے لیے پیہم جِدّ و جُہد اور اس کے لیے سمع و طاعت کے اصول پر مبنی نظامِ جماعت کے قیام کا معاملہ ــــــ گویا فی الجملہ احقاق حق اور ابطالِ باطل کی منظم سعی جو ہر مومن کے لیے فرضِ عین کا درجہ رکھتی ہے تو وہ یا تو سرے سے خارج از بحث ہو گئی یا زیادہ سے زیادہ ایک اضافی نیکی قرار پا کر رہ گئی اور اس سے بالا ہی بالا اور ورے ہی ورے اسلام و ایمان اور تقویٰ و احسان کے جملہ مراحل طے پانے لگے!

اللہ! اللہ کوئی فرق سا فرق ہے اور تفاوت سا تفاوت! ع "ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا!" کے مصداق کجا وہ کیفیت کہ صحابہ کرامؓ جذبۂ جہاد سے سرشار، بیک زبان، رجزیہ انداز میں یہ شعر پڑھ رہے ہیں: نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوا مُحَمَّدًا

عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا

کجا یہ حال کہ چودھویں صدی ہجری کے ایک متنبّی اور اُس کی ذرّیتِ صلبی و معنوی نے تو جہاد بالسیف کو باقاعدہ منسوخ ہی قرار دے دیا، مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا حال بھی عملاً کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ ع

"کہ رہوارِ یقین ما بصحرائے گماں گم شد!"

باب دوم

اسلام
برِّعظیم پاک وہند میں

- ورودِ اوّل : سندھ میں
- ورودِ ثانی : شمال مغرب سے
- ہندوستان میں مسلمانوں کے عروج لیکن اسلام کے زوال کی انتہا : اکبر اعظم علیہ ما علیہ
- الفِ ثانی کا تجدیدی کارنامہ :
  - شیخ احمد سرہندیؒ
  - شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ
  - امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ

برّصغیر پاک و ہند میں خورشیدِ اسلام اولاً عینِ غرب یعنی مکران اور بلوچستان کے افق پر خلافتِ بنی اُمیّہ کے زمانے میں اس وقت طلوع ہوا جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال پر اسّی برس[1] بیت چکے تھے اور دورِ خلافتِ راشدہ کو ختم ہوئے بھی نصف صدی کے لگ بھگ عرصہ گذر چکا تھا اور اسلام کے صدرِ اوّل کا جوش و خروش کم ہوتے ہوتے تقریباً معدوم کے حکم میں داخل ہو چکا تھا۔ چنانچہ سرزمینِ ہند پر 'بابُ الاسلام' سندھ کے راستے اسلام کا یہ ورودِ اوّل بھی کسی مثبت تبلیغی جذبے یا احساسِ فرض کا مرہونِ منّت نہ تھا بلکہ ایک وقتی اور فوری اشتعال کا نتیجہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت اسلام کی کرنیں موجودہ پاکستان کے بھی صرف نصف جنوبی کو منوّر کر کے رہ گئیں اور اس مدّ میں بھی جذر کے آثار فوراً ہی شروع ہو گئے اور برّصغیر پاک و ہند میں اسلام کی یہ آمدِ اوّلین نہایت محدود بھی رہی اور حد درجہ عارضی بھی۔

گویا سرزمینِ ہند دورِ نبویؐ اور عہدِ خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ کی برکات سے تو مطلقاً محروم ہی رہی جس میں ایمان اور یقین کا کیف و سرور اور جہاد و قتال کا جوش و خروش باہم شیر و شکر تھے اور جہاد کی اصل غرض و غایت فریضۂ شہادت علی النّاس کی ادائیگی کا جذبہ تھا یا حصولِ مرتبۂ شہادت[2] کا ذوق و شوق نہ کہ ملک گیری و کشور کشائی کی ہوس یا مالِ غنیمت و اسبابِ عیش کی حرص۔ مزید محرومی یہ رہی کہ اسے اس خالص عربی الاصل اسلام کے اثرات سے متمتّع ہونے کا موقع بھی بہت ہی کم ملا جس میں دین و دنیا کی وحدت و یگانگت ابھی اس حد تک باقی تھی کہ رات کے راہب ہی دن کے شہسوار[3] ہوتے تھے اور ایک ہی انسان کے ایک ہاتھ میں قرآن ہوتا تھا اور دوسرے میں تلوار!

بعد ازاں جنوبی ہند کے مغربی ساحل پر تو اسلام کے انوار و برکات کا ترشّح عرب تاجروں

---

[1] آنحضورؐ کا سنِ وفات ۶۳۲ء ہے اور سندھ پر محمد بن قاسمؒ کا حملہ ۷۱۲ء میں ہوا۔

[2] بقول علامہ اقبال ؎ شہادت ہے مقصود و مطلوبِ مومن ۔۔۔ نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

[3] رستم، سپہ سالارِ افواجِ ایران کو اس کے مخبروں نے مسلمان افواج کے جو حالات بتائے تھے ان میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں کہ "هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ" یعنی "وہ رات کے راہب ہیں اور دن کے شہسوار!"

کی آمد و رفت کے طفیل تقریباً مسلسل ہوتا رہا اگرچہ اس کی نوعیت ایک ہلکی سی پھوار یا دھیمی سی آنچ کی تھی جس کے اثرات زیادہ محسوس و مشہود نہیں ہوتے ـــــــ لیکن شمال مغربی سرحد پر واقع پہاڑی درّوں سے اسلام کا سیلاب کم و بیش تین صدیوں بعد شروع ہوا اور مزید لگ بھگ دو سو برس تک اس کی نوعیّت واقعتہً پہاڑی ندی نالوں کے سیلاب ہی کی سی رہی کہ زور و شور اور غیظ و غضب کے ساتھ آیا اور آناً فاناً گذر گیا۔ اور اگرچہ اس بار موجودہ پاکستان کے نصف شمالی کی قسمت جاگی کہ وہ ۱۰۰۰ء کے آس پاس ہی باقاعدہ اسلامی قلمرو میں شامل ہو گیا تاہم واقعہ یہی ہے کہ محمود غزنوی اور محمد غوری کے حملوں کی اصل حیثیّت پہاڑی نالوں کے سیلاب سے زیادہ نہ تھی جو ادھر آتا ہے اُدھر گذر جاتا ہے!

تختِ دہلی پر مسلمانوں کو باقاعدہ تمکّن ۱۲۰۶ء کے لگ بھگ حاصل ہوا۔ اور ہندوستان میں مسلمانوں کا دورِ حکومت عروج و زوال اور مدّ و جذر کے مختلف مدارج و مراحل سے گذرتا ہوا ۱۸۵۷ء کے "غدر" پر ختم ہو گیا۔ ان ساڑھے چھ سو سالوں کے نصف اوّل کے دوران، یعنی ۱۲۰۶ء سے ۱۵۲۶ء تک پہلے کچھ ترکی النسل غلام[1] بادشاہ تختِ دہلی کو زینت بخشتے رہے اور بعد ازاں کچھ افغان خاندان خلجی لودھی وغیرہ۔ حکمران رہے، اور نصفِ ثانی یعنی ۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک مغلوں کا دور رہے جس کے کُل سوا تین سو سالوں میں سے پہلے پونے دو سو برس[2] اُن کی اصل عظمت و سطوت کا زمانہ ہے اور بعد کے ڈیڑھ سو برس اصلاً ایک عظیم عمارت کے کھنڈروں میں تبدیل ہونے اور بالآخر زمین بوس ہو جانے کا عرصہ! (ع "کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی!")

گویا ہندوستان میں اسلام آیا ہی اس وقت جب وہ اپنی نشاۃِ اُولیٰ کے بعد زوالِ اوّل سے پوری شدّت کے ساتھ دوچار ہو چکا تھا۔ اور اس کی وحدتِ فکری بھی پارہ پارہ ہو چکی تھی اور وحدتِ ملّی بھی۔ چنانچہ ایک طرف عالمِ اسلام کے قلب میں عرب قوّت کا تقریباً خاتمہ ہو

---

[1] تاریخ اسلام کا یہ دَور عجیب ہے کہ از شرق تا غرب غلاموں ہی حکومتیں قائم تھیں۔ چنانچہ ہند میں خاندانِ غلاماں حکمران تھا تو مصر میں مملوک سریر آرائے مملکت تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے غلاموں کو کہاں سے اٹھا کر کہاں تک پہنچایا!۔

[2] یعنی ۱۷۰۷ میں اورنگ زیب عالمگیر علیہ الرّحمۃ کی وفات تک!

چکا تھا اور خلافتِ بنی عبّاس کا دیا چراغِ سحری کے مانند ٹمٹما رہا تھا[1] اور پوری مملکت طوائف الملوکی کا شکار بھی گویا بنی اسمٰعیلؑ کے حق میں وعیدِ خداوندی "اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ" پوری طرح ظاہر ہو چکی تھی ـــــ اور دوسری طرف خلافتِ اسلامی کی وہ توحیدی شان ایک داستانِ پارینہ بن چکی تھی جس میں نہ دین و دنیا کے مابین کوئی دوئی تھی نہ مذہب و ریاست میں کوئی جدائی اور خدا کے جلال[2] و جمال کے مظاہر جدا تھے نہ سلطانی و درویشی کے مصداق مختلف! ـــــ اور اس کی جگہ قیادت و سیادت اور رہنمائی و پیشوائی کے ضمن میں مُلوک، احبار اور رُہبان پر مشتمل وہ قدیم تثلیث[3] پوری طرح رائج و نافذ ہو چکی تھی جو ایک اسلام کے سوا دنیا کی تمام تہذیبوں اور تمدنوں کا جزوِ لاینفک رہی ہے اور جس سے پیشگی خبردار کیا تھا عہدِ اوّلین ہی میں حضرت عبداللہ ابن المبارکؒ نے اپنے اس حد درجہ فصیح و بلیغ شعر میں[4] :

وَمَا اَفْسَدَ الدِّیْنَ اِلَّا الْمُلُوْکُ
وَاَحْبَارُ سَوْءٍ وَرُھْبَانُھَا

ـــــ اور اگرچہ اسلام کے اعجاز نے اس دورِ زوال و انحطاط میں بھی بہت سی عظیم اور استثنائی

---

[1] چنانچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت کے آغاز کے نصف ہی صدی کے اندر اندر یہ چراغ بالکل بجھ گیا اور ۱۲۵۸ء میں تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد میں وہ قتلِ عام ہوا کہ الامان والحفیظ ـــــ اور آخری عبّاسی خلیفہ مستعصم باللہ اس طرح سرِ عام ذبح کر دیا گیا جیسے کسی بھیڑ یا بکری کو حلال کر دیا جائے ـ جس پر خون کے آنسو بہائے شیخ سعدیؒ نے :

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں ـ بر زوالِ مُلکِ مستعصم امیر المؤمنیں!
اے محمدؐ گر قیامت سر بروں آری زخاک ـ سر بروں آر و قیامت درمیانِ خلق بیں

[2] شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود ـ فقرِ جُنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمالِ بے نقاب

[3] گویا علامہ اقبال کا یہ شعر کہ

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ ـ خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

ظاہری طور پر بھی مطابقِ واقعہ ہے اور معنوی طور پر بھی ـ خصوصاً تاریخِ اسلام کے اس دور میں جس کا ذکر یہاں ہو رہا ہے ایک طرف تثلیث کے فرزندوں نے صلیبی جنگوں سے عالمِ اسلام کا عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا اور دوسری طرف یہ معنوی تثلیث اسلام کی وحدانیت کی جڑیں کھوکھلی کر چکی تھی!

[4] حضرت عبداللہ ابن المبارکؒ کے اس شعر کی اتنی ہی فصیح و بلیغ ترجمانی کی ہے علامہ اقبالؒ نے اپنے اس شعر میں :

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری ـ اے کُشتۂ مُلّائی و سلطانی و پیری

(EXCEPTIONAL) شخصیتیں پیدا کیں جیسے صلاح الدّین ایوبیؒ اور ناصر الدّین محمودؒ ایسے درویش بادشاہ اور امام ابن تیمیہؒ ایسی جامع سیف و قلم شخصیت' تاہم واقعہ یہ ہے کہ اس دَور تک ایک جانب مسلمان حکمران و سلاطین اکثر و بیشتر "آیۂ اِنَّ الْمُلُوكَ[1] " کے مصداقِ کامل بن چکے تھے اور دوسری جانب علماء و صوفیاء کی عظیم اکثریت بھی آیاتِ قرآنی " لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ" (المائدہ: ۶۳) اور " اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ " (توبہ: ۳۴) کی مظہرِ اتم بن چکی تھی۔ فَوَاحَسْرَتَاوَيَااَسَفَا!

ہندوستان میں اسلام وارد تو ایسی منقسم حالت میں ہوا تھا کہ اصحابِ سیف و سناں جدا تھے اور صاحبانِ قرطاس و قلم جدا، اور زیبِ منبر و محراب اور تھے اور زینتِ میدانِ جنگ و قتال اور، چنانچہ ابتداء میں ایک جانب محمود غزنوی اور محمّد غوری کی سرفروشانہ ترکتازیاں تھیں اور دوسری جانب شیخ اسمٰعیل بخاری اور شیخ علی ہجویری رحمہما اللہ کی تبلیغ و تلقین اور تعلیم و تربیت کی انتھک کوششیں، اور بعد میں ایک طرف قطب الدّین ایبک اور بختیار خلجی کی تلواریں مملکت کی توسیع اور استحکام کا فریضہ سرانجام دے رہی تھیں تو دوسری طرف خواجگانِ سلسلۂ چشت رحمہم اللہ نفوس کے تزکیے، قلوب کے تصفیے اور سیرت و کردار کی تعمیر میں مصروف تھے۔ تاہم غنیمت ہے کہ آغاز میں ان دونوں حلقوں کے مابین گہرا ربط و تعلّق موجود تھا جس کا عظیم ترین نشان (SYMBOL) ہے سلطان التمش کی جامع الصّفات شخصیت کہ ایک طرف ایک عظیم مملکت کا حکمران بھی تھا اور دوسری طرف خواجہ قطب الدّین بختیار کاکیؒ کا حلقہ بگوش اور حد درجہ عابد و زاہد انسان بھی، ـــــــ یہاں تک کہ حضرتِ خواجہ کے انتقال پر جب لوگ نمازِ جنازہ کے لیے جمع ہوتے

---

[1] علّامہ اقبالؒ مرحوم نے الفاظ قرآنی " اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً " (سورۃ النمل: ۳۴) کے حوالے سے کس قدر عمدہ اشعار کہے ہیں:

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ اِنَّ الْمُلُوک
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اُس کو حکمراں کی ساحری

جادُوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بُتانِ آذری!

اور وہاں خواجہ مرحوم کی اس وصیت کا اعلان کیا گیا کہ میری نمازِ جنازہ صرف وہ شخص پڑھائے جس نے عمر بھر کبھی زنا نہ کیا ہو اور جس کی نہ کبھی تکبیرِ اُولیٰ فوت ہوئی ہو نہ عصر کی سنّتیں چھوٹی ہوں، نتیجۃً مجمعے پر سکتہ سا طاری ہو گیا اور تمام لوگ حیران و پریشان ہو کر رہ گئے کہ ایسا شخص کون ہو سکتا ہے جس میں یہ ساری شرطیں پوری موجود ہوں تو قدرے تأمّل و انتظار کے بعد جو شخص اگلی صف سے امامت کے لیے نکلا وہ خود بادشاہِ وقت سلطان التمش تھا۔!

لیکن جلد ہی یہ رابطہ کمزور پڑ گیا اور رجالِ سلطنت اور رجالِ دین کے مابین ایک بُعد اور فصل پیدا ہو گیا اور اُن کے شب و روز ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں بالکل متضاد ہو گئے اور جیسے جیسے وقت گذرا یہ خلیج عمیق سے عمیق تر اور وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔

مزید برآں، ہندوستان میں اسلام علاقہ ماوراء النہر سے آیا تھا جہاں خود مذہبی حلقوں میں مدرسہ و خانقاہ کی تقسیم راسخ ہو چکی تھی اور اُن کے مابین مسابقت ہی نہیں منافرت کا آغاز ہو چکا تھا اور جہاں مدارس میں حنفی فقہ، اشعری و ماتریدی عقائد، یونانی فلسفہ و منطق اور ان سب کے معجونِ مرکّب علم کلام کا دَور دَورہ تھا، اور خانقاہوں میں وحدت الوجود کا سکّہ رواں تھا۔ لہٰذا اسلامی ہند میں مذہب کی عمارت انہی دو ستونوں پر استوار ہوئی یعنی ایک شدید حنفیّت اور دوسرے وجودی تصوّف۔

قرآنِ حکیم یہاں ابتدا ہی سے صرف ایک کتابِ مقدّس کی حیثیت سے متعارف ہوا اور علمِ حدیث سے یہ سرزمین دیر تک نابلد محض رہی اور چونکہ عربی یہاں صرف اعلیٰ علمی حلقوں تک محدود رہی اور عام بول چال، تصنیف و تالیف، شعر و ادب اور سرکار دربار سب پر فارسی کا قبضہ رہا لہٰذا قرآن و حدیث سے یہ بُعد اور دُوری نہ صرف یہ کہ قائم رہی بلکہ مرورِ ایّام کے ساتھ مزید بڑھتی چلی گئی۔

اس غُلُوّ فی الحنفیّت اور بُعد عن حدیثِ الرّسُولؐ کے ضمن میں ایک نہایت دلچسپ لیکن ساتھ ہی حد درجہ عبرت انگیز واقعہ نقل ہوا ہے کہ جب سُلطان غیاث الدّین تغلق کے دربار میں ایک خاص مسئلے پر شیخ الوقت خواجہ نظام الدّین اولیاء اور شیخ الاسلام قاضی جلال الدّین کے مابین مناظرہ ہوا اور اپنے موقف کے حق میں بطورِ دلیل پیش کرنا چاہا خواجہ نظام الدّین نے ایک حدیث رسولؐ

کو تو بلا کسی جھجک اور تامل کے بھرے دربار میں ڈنکے کی چوٹ کہا شیخ الاسلام نے کہ:

"تو مقلدِ ابو حنیفہ ہستی، ترا با حدیثِ رسولؐ چہ کار؟ قولِ ابی حنیفہ بیار!"

تم مقلدِ ابو حنیفہ ہو یعنی حنفی ہو تمہیں حدیثِ رسولؐ سے کیا سروکار؟ اگر امام ابو حنیفہ کا کوئی قول پیش کر سکتے ہو تو کرو!

جس پر حضرتِ خواجہ نے یہ کہتے ہوئے مناظرہ ختم کر دیا اور دربار سے اُٹھ گئے کہ:

"سُبحان اللہ! کہ با وجود قولِ مصطفویؐ از من قولِ ابی حنیفہؒ می خواہند!" (سیر العارفین)

سُبحان اللہ! نبی اکرمؐ کے فرمان کے ہوتے ہوئے مجھ سے امام ابو حنیفہؒ کے قول کا مطالبہ کیا جا رہا ہے!

اُوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اسلامی ہند میں آغاز ہی سے دو حکومتیں قائم ہو گئی تھیں ایک ظاہری حکومت جس کا اقتدار یا زمین پر قائم تھا یا انسانوں کے جسموں پر اور دوسری باطنی حکومت جس کا سکّہ قلوب کی دنیا میں رَواں تھا۔ پہلی حکومت اصلاً ملوک و سلاطین اور اُمراء و عمایدِ سلطنت کی تھی اور اُن کے ساتھ بطورِ تتمہ یا ضمیمہ منسلک تھے ائمہ و خطباء، مدرسین و معلّمین اور مفتی و قاضی حضرات، اور اس دُنیا میں جیسے کہ عرض کیا گیا فقہ ہی کو گویا کل دین کی حیثیت حاصل تھی جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ متشدّدانہ ظاہر پرستی اور قانونی مُوشگافی کا دَور دَورہ ہو گیا اور رفتہ رفتہ دین و مذہب نے بالکل خشک قانونیت کی شکل اختیار کر لی۔

دوسری طرف تصوّف کے خانوادوں میں سے ارضِ ہند پر سب سے پہلے چشتی سلسلے نے قدم جمائے اور کم و بیش دو صدیوں تک خواجگانِ چشت ہی کا طوطی بولتا رہا۔ جیسے ہی اس سلسلے میں قدرے ضعف کے آثار پیدا ہوئے وسطی اور جنوبی ہند میں سہروردیہ اور شطّاریہ سلسلوں کو فروغ حاصل ہوا اور شمال مغرب میں خصوصاً موجودہ پاکستان کے وسطی علاقوں میں قادریہ سلسلے نے عروج پایا۔ ان تمام سلاسل میں وحدت الوجود کو گویا اصولِ موضوعہ کی حیثیت حاصل تھی اور اس کے زیرِ اثر کیف و سرور، جذب و مستی اور وجد و رقص کا ذوق و شوق بڑھ رہا تھا اور فنا فی اللہ کو شغل و سلوک کے منتہائے مقصود کی حیثیت حاصل ہو رہی تھی جس کے باعث قوائے مضمحل ہو رہے تھے اور جذبۂ جہاد تو دُور رہا جذبۂ عمل بھی سرد پڑتا جا رہا تھا!

مزید برآں ——— باطنی احوال و کوائف پر توجہ کے ارتکاز کے باعث ظاہر کی اہمیت

کم ہوتی جارہی تھی، طریقت کے عروج کے ساتھ ساتھ شریعت کا استخفاف ہونے لگا تھا، عشق و محبّت کی سرمستی میں پابندیٔ شریعت اور اتباعِ سُنّت پر پھبتیاں کسی جانے لگی تھیں اور ستم بالائے ستم یہ کہ ہمہ اوستی نظریات کے باعث وسیع المشربی اتنی بڑھتی جارہی تھی کہ رام اور رحمٰن ایک نظر آنے لگے تھے، مسجد و مندر اور دیر و کلیسا میں کوئی فرق نہ رہا تھا، اور ع "با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام" پر عمل عام ہوگیا تھا نتیجۃً ملّتِ اسلامی کا جُداگانہ تشخّص ہی شدید خطرات سے دوچار ہوگیا تھا۔

علمائے ظاہر یا "حاملانِ دین اور حامیانِ شرعِ متین" کی جانب سے اس طرزِ عمل کی مخالفت ایک فطری امر تھا لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدرسہ و خانقاہ کی باہمی چشمک رفتہ رفتہ بُغض اور عداوت میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ اسلامی ہند کی پوری تاریخ رجالِ سلطنت اور رجالِ دین کی باہمی کشمکش اور علماء اور صوفیاء کی باہمی آویزش کی مسلسل داستان ہے جس میں ایک بُعدِ رابع (FORTH-DIMENSION) کا اضافہ ہوگیا اوائل عہدِ مغلیہ میں ایران سے شیعیّت کی درآمد سے، جس نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا اور جس کے زیرِ اثر مشرکانہ عقائد و خیالات اور بدعات و رسُومات کا ایک سیلاب ارضِ ہند پر آگیا!

مسلم انڈیا کا سُنہرا دَور بلاشبہ اس کا صدرِ اوّل ہی تھا یعنی دورِ خاندانِ غلاماں، جس میں مُلوک، احبار، رہبان کی تثلیث اگرچہ اصُولاً تو موجود تھی تاہم ابھی اس میں نہ تنزّل و انحطاط کے آثار نمایاں ہوئے تھے نہ باہمی بُغض و عناد کے بلکہ جیسا کہ اُوپر عرض کیا جاچکا ہے نہ صرف یہ کہ باہمی توافق تعاون موجود تھا بلکہ بعض مثالیں انتہائی حسین امتزاج کی بھی نظر آجاتی ہیں لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرا زوال و پستی کے جانب قدم بڑھتے گئے اور نہ صرف یہ کہ متذکرہ بالا تثلیث کا گھناؤنا پن بڑھتا چلا گیا بلکہ اس کی جڑیں بھی مسلم سوسائٹی میں مزید گہری اُترتی چلی گئیں ـــــ تا آنکہ مغلِ اعظم شہنشاہِ اکبر کے زمانے میں یہ صورتِ حال اپنے نقطۂ عروج (CLIMAX) کو پہنچ گئی اور حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ عین اُس وقت جبکہ ہندوستان کی سرزمین پر مسلمانوں کا خورشیدِ حکومت نصفُ النہار پر چمک رہا تھا اسلام پر انتہائی غربت اور شدید بے کسی و کس مپرسی کی حالت طاری ہوگئی! یہاں تک کہ نام نہاد 'دینِ الٰہی' نے دینِ محمّدی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسّلام کی کامل بیخ کنی کرنے یا کم از کم اُسے سرزمینِ ہند سے ملک بدر کر دینے کا بیڑا اٹھالیا! یہ دوسری بات ہے کہ فطرت کے اس اٹل قانون کے مطابق کہ جذر جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اسی کی کوکھ سے مدّ کے آثار جنم لیتے ہیں

ہندوستان میں اسلام کے زوال کی انتہا کا یہ دور سرزمین پاک و ہند میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی تمہید بن گیا! بقول علامہ اقبال ؎

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں ۔۔۔ توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰؑ طلسمِ سامری

سولہویں صدی عیسوی کے وسط کے لگ بھگ جب مغل اعظم علیہ ما علیہ کے آفتاب اقتدار نے ابتدائی موانع و مشکلات کی بدلیوں سے نکل کر پوری آب و تاب کے ساتھ چمکنا شروع ہی کیا[1] تھا اور ہندوستان میں اسلام کے انتہائی زوال و انحطاط کے دورِ سیاہ کا آغاز ہونے ہی والا تھا اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کے تحت سرزمینِ ہند میں دو خورشید ہدایت بھی طلوع ہوئے: ایک مجدّد الفِ ثانی شیخ احمد سرہندیؒ (جن کی ولادت ۱۵۶۴ء میں ہوئی) اور دوسرے: حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ (جن کا سنِ ولادت ۱۵۵۱ء ہے) جن کی مصلحانہ و مجدّدانہ مساعی نے حالات کے دھارے کا رُخ اس حد تک موڑ کر رکھ دیا کہ تقریباً چار سو سال کے بعد اسلامی ہند کو غازی اورنگزیب عالمگیرؒ کی ذات میں گویا غازی صلاح الدین ایوبیؒ اور سلطان ناصر الدین محمودؒ کے محاسن کا جامع حکمران نصیب ہوا اور اس طرح مسلم انڈیا کے اوّل و آخر کے مابین ایک مشابہت اور مماثلت پیدا ہو گئی!

ان میں سے مقدّم الذکر یعنی شیخ مجدّد کی مساعی میں پُرجوش مجدّدانہ رنگ نمایاں تھا اور مؤخر الذکر یعنی شیخ محدّث کی کوششوں پر خاموش مصلحانہ انداز غالب تھا۔ چنانچہ حالات کے رُخ کی فوری تبدیلی میں اصل دخل یقیناً حضرتِ مجدّدؒ کی مساعی کو حاصل ہے جبکہ سرزمینِ ہند میں علم حدیث نبویؐ کا پودا لگانے کی جو خدمت حضرتِ محدّثؒ نے سرانجام دی اس کے اثرات بہت دیرپا اور دُوررس ثابت ہوئے۔

حضرتِ مجدّدؒ کی تجدیدی مساعی کا اصل رُخ تصحیحِ عقائد، ردِّ بدعات، التزامِ شریعت اور اتّباعِ سُنّت کی جانب تھا۔ اور اس ضمن میں انہوں نے رائج الوقت علمی و نظری اور اخلاقی عملی ہر نوع کی گمراہیوں اور ضلالتوں پر بھرپور تنقید کی، چنانچہ تردیدِ شیعیّت پر بھی نہ صرف یہ کہ ان کے مکاتیب میں بہت زور ہے بلکہ "ردِّ روافض" کے عنوان سے ایک مستقل رسالہ بھی انہوں نے

---

[1] اکبر کی حکومت کو استحکام ۱۵۶۱ء میں پانی پت کی دوسری جنگ میں فتح یاب ہونے کے بعد ہی حاصل ہوا تھا۔

تحریر فرمایا۔ اور اگرچہ ان کی ان اساسی کوششوں سے بھی 'طریقت' اور 'شریعت' کے بُعد کو کم کرنے اور اس بڑھتی ہوئی خلیج کے پاٹنے میں بہت مدد ملی تاہم اس میدان میں اُن کا اصل کارنامہ فلسفہ وحدت الوجود کے مقابلے میں نظریۂ وحدت الشہود کی تدوین و ترویج ہے جس نے ان تمام مفاسد کا سدِّباب کر دیا جو تصوّف کی راہ سے حملہ آور ہو رہے تھے، نتیجتہً باطن کے ساتھ ساتھ ظاہر کی اہمیّت بھی دوبارہ مسلّم ہوئی، عشق و محبّت کے ساتھ ساتھ اطاعت و اتّباع کا جذبہ بھی از سرِ نو بیدار ہوا، فنافی اللہ کے بجائے بقاباللہ کو مقصود و مطلوب کا درجہ حاصل ہوا اور جذب و سکر اور مستی و بے خودی کے بجائے جذبۂ عمل اور جوشِ جہاد نمایاں ہوتے ——— اور ان سب کا حاصل یہ کہ ہند میں ملّتِ اسلامیہ کا جداگانہ تشخّص از سرِ نو مستحکم ہو گیا۔ اور یہ خطرہ ٹل گیا کہ کہیں سرزمینِ ہند میں جیسے مذہبوں اور فلسفوں کے بہت بڑے عجائب گھر کی حیثیّت حاصل ہے دینِ محمدیؐ بھی صرف ماضی کی ایک یادگار بن کر نہ رہ جائے۔ بقول علّامہ اقبالؔ مرحوم:

حاضر ہوا میں شیخِ مجدّدؒ کی لحد پر — وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے — جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیِ احرار

وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار!

سلسلۂ نقشبندیہ جس کا پودا سرزمینِ ہند میں حضرت مجدّدؒ کے مرشد خواجہ باقی باللہ کے ہاتھ سے لگا، اصلاً بھی جملہ سلاسلِ طریقت میں سے اقربِ الی الشّریعت ہے، اور حضرت مجدّدؒ کے ہاتھوں جو عظیم الشان کارنامہ سرانجام پایا اس کی بنیاد بھی خواجہ باقی باللہ کے ہاتھوں پڑ چکی تھی تاہم واقعہ یہ ہے کہ اس میں جو شان حضرتِ مجدّدؒ نے پیدا کی وہ انہی کا حصّہ ہے اور یوں تو بعد میں سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ بھی ہندوستان میں جاری رہا اور اس سے بہت سا خیر پھیلا لیکن ہند میں سرمایۂ ملّت کی نگہبانی کا فریضہ جس شان کے ساتھ حضرت مجدّدؒ کے اخفاد و خلفاء نے ادا کیا اس میں کوئی دوسرا ان کے ساتھ شریک نظر نہیں آتا۔ یہاں تک کہ یہی وہ واحد سلسلہ ہے جس کے منسلکین نے ذکر و شغل اور مجاہدہ و ریاضت کے علاوہ کلمۂ حق کہنے کی پاداش اور ردِّ بدعت و رفض کے جرم کی سزا کے طور پر حوالۂ زنداں ہوتے اور جان پر کھیل جانے کی روایات کو بھی از سرِ نو

تازہ کیا گویا ع "من از سرِ نَو جلوہ دہم دار و رسن را!" (سرمد)

بایں ہمہ حضرتِ مجدّدؒ کے یہاں بھی حنفیّت میں غلو اُسی شدّت کے ساتھ موجود ہے جو مُسلم انڈیا کی پُوری تاریخ کا جزوِ لاینفک ہے۔ گویا حضرتِ مجدّدؒ کی مساعی سے اسلام ہند میں اس مقام تک تو پہنچ گیا جہاں سے (دورِ غلاماں میں) اس کا آغاز ہُوا تھا لیکن ع "دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تو!" کا عمل اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔

البتّہ شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ کی خدمات کو اس سمت میں ایک مزید قدم سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ شیخ محدّثؒ کی شخصیّت بعض پہلوؤں سے تو حضرتِ مجدّدؒ ہی کی شخصیّت کا ظلّ معلوم ہوتی ہے لیکن بعض دوسرے اعتبارات سے اُن کی حیثیّت تقریباً ایک ڈیڑھ صدی بعد طلوع ہونے والے آفتابِ رُشد و ہدایت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے پیشرو یا مقدمۃ الجیش کی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ صوفی بھی تھے اور خواجہ باقی باللہ ہی کے مرید بھی لیکن اس کے باوجود کہ انہیں بھی وحدتُ الوُجود سے بُعد تھا وہ اس کی تردید میں اس درجہ سرگرم نظر نہیں آتے، اسی طرح وہ حنفی بھی تھے لیکن متشدّد نہیں بلکہ فقہ حنفی کا رشتہ حدیثِ رسولؐ کے ساتھ جوڑنے کی سعی اوّلاً اُنہی سے شروع ہوئی۔ ان دونوں پہلوؤں سے تو وہ شیخ مجدّدؒ اور امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بَین بَین نظر آتے ہیں لیکن اس اعتبار سے کہ امام الہندؒ نے اسلام کا رشتہ اس کی اصلِ ثابت، یعنی قرآنِ حکیم کے ساتھ از سرِ نو قائم کرنے کی کوشش کا آغاز کیا اور شیخ محدّثؒ نے دین کا تعلق اُس 'اصلِ ثابت' کی 'فرعِ اوّل' کے ساتھ قائم کرنے کی کوشش کی، اُن کی شخصیت حضرت امام الہندؒ کی شخصیّت کا مقدّمہ یا دیباچہ نظر آتی ہے ——— اور واقعہ یہ ہے کہ یہی حضرت محدّث کی اصل خدمت (CONTRIBUTION) ہے کہ انہوں نے علمِ حدیث کا پودا سرزمینِ ہند میں لگایا۔ اور حدیثِ رسولؐ کی باقاعدہ درس و تدریس کا بھی آغاز کیا اور اس سے متعلق تصنیف و تالیف کا بھی! چنانچہ خود انہوں نے مشکوٰۃ شریف کا ترجمہ فارسی میں کیا اور اُن کے صاحبزادے شیخ الاسلام نور الحقؒ نے صحیح بخاری کو فارسی میں منتقل کیا۔ مزید برآں انہوں نے مشکوٰۃ کی ایک مفصّل شرح (لمعات التنقیح) عربی زبان میں اور اس سے بھی زیادہ طویل شرح (اَشعّۃ اللّمعات) فارسی

میں تحریر کی، علاوہ ازیں اسنادِ حدیث اور اسماء الرجال پر بھی ایک کتاب تصنیف کی اور لمعات کے مقدمے کے ذریعے بھی عُلومِ حدیث کا ایک جامع تعارف کرا دیا!

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تجدیدی مساعی کا تفصیلی جائزہ تو ظاہر ہے کہ ان مختصر شذرات کی حدود سے باہر ہے تاہم یہ عرض کیے بغیر نہیں رہا جاتا کہ دورِ صحابہؓ کے بعد کی پوری اسلامی تاریخ میں ان کی سی جامعیّتِ کبریٰ کی حامل کوئی دوسری شخصیّت نظر نہیں آتی اور اس میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ واقعتہً دورِ جدید کے فاتح ہیں اور اس اعتبار سے خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ انہوں نے حضرتِ مجدّدؒ اور شیخ محدّثؒ دونوں کی مساعی کو منطقی انتہا تک پہنچایا خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ وہ دونوں اصلاً امام الہندؒ ہی کی شخصیّت کی تمہید تھے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

چنانچہ ایک طرف حضرت مجدّدؒ نے ہند میں اُمّتِ مسلمہ کو از سرِ نو ایک مستحکم داخلی تشخّص عطا کیا تو شاہ صاحبؒ نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دے کر اُمّت کے خلاف اُٹھنے والے سب سے بڑے خارجی طوفان کے مقابلے کا سامان کیا اور حضرتِ مجدّدؒ نے "ردِّ روافض" سے جس کام کا آغاز فرمایا تھا اس کی تکمیل شاہ صاحبؒ نے "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" اور "قرۃ العینین فی تفضیل الشیخینؓ" اور ان کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیزؒ نے "تحفۂ اثنا عشریہ" ایسی کتابوں کی تصنیف سے کی ——— اور دوسری طرف شیخ محدّثؒ نے علمِ حدیث کا جو پودا سرزمینِ ہند میں لگایا تھا شاہ صاحب اور ان کے خلفاء نے نہ صرف یہ کہ اس کی آبیاری کی بلکہ اپنی انتھک کوششوں سے صنم خانۂ ہند کو علمِ حدیثِ نبویؐ کا ایک عظیم الشّان چمن بنا دیا۔ عجیب مشابہت ہے کہ شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ نے مشکوٰۃ المصابیح کی ایک شرح عربی میں لکھی تھی اور ایک فارسی میں۔ اسی طرح امام الہندؒ نے موطا امام مالکؒ کی ایک شرح عربی میں لکھی تھی (المسوّی) اور ایک فارسی میں لکھی (المصفّٰی)۔ واضح رہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک موطا امام مالکؒ کو علمِ حدیث کے ذیل میں اصل اوّل کی حیثیّت حاصل ہے۔

ان پر مستزاد ہیں شاہ صاحبؒ کے وہ کارنامے جن کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی

نشاۃِ ثانیہ کے طویل عمل کا اصل نقطۂ آغاز ان ہی کی ذاتِ گرامی ہے:

مثلاً ایک یہ کہ علمِ فقہ کے میدان میں ایک طرف آپؒ نے "عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید" تصنیف فرمائی جس سے تقلیدِ جامد اور اجتہادِ مطلق کے مابین اعتدال کی راہ واضح ہوئی اور دوسری طرف "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" ایسی معرکۃ الآرا کتاب لکھی جس نے فقہی اختلافات کی اہمیت کو کم کرنے کے ضمن میں نہایت دور رس نتائج پیدا کیے۔

دوسرے یہ کہ اپنی مشہورِ زمانہ تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" کے ذریعے آپ نے حکمتِ دین کو ایک باقاعدہ علم کی حیثیت دے دی اور اسلام کے نظامِ عقائد، نظامِ عبادات اور نظامِ معاشرت و معاملات کو ایک مربوط اور منضبط نظامِ زندگی کی حیثیت سے پیش کیا۔ جس کی آنے والے دور میں شدید ترین ضرورت پیش آنے والی تھی ——— اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے اسلام کا رشتہ اس کی اصل ثابت یعنی قرآنِ حکیم کے ساتھ از سرِ نو قائم کرنے کے طویل عمل کا باقاعدہ آغاز فرما دیا۔ چنانچہ ایک طرف قرآن مجید کے فارسی ترجمے کے ذریعے قرآن کے مطالب و مفاہیم کو عوام تک پہنچانے کا اہتمام کیا۔ اگرچہ اس پر انہیں شدید مخالفت حتیٰ کہ عوامی یورش تک کا سامنا کرنا پڑا۔ اور دوسری طرف "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" کی تصنیف کے ذریعے علمِ تفسیر کو ایک چیستاں کے بجائے ایک باقاعدہ فن کی حیثیت سے متعارف کرایا اور درمیانی استعداد تک کے حامل لوگوں کے لیے فہمِ قرآن کی راہیں آسان کر دیں۔

شاہ صاحبؒ کے جلیل القدر فرزندوں میں سے دو یعنی شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ نے قرآن مجید کے بامحاورہ اور لفظی ترجمے کر کے گویا اپنے والدِ مرحوم کے شروع کیے ہوئے کام کو منطقی انتہا تک پہنچا دیا ——— اور کون کہہ سکتا ہے کہ آج برِصغیر پاک و ہند میں علم و فہمِ قرآن کا جو غلغلہ اور ہمہمہ ہے وہ سب دہلی کے اسی عظیم خانوادے کی مساعی کا نتیجہ نہیں۔

الغرض ویسے تو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا علمی اصلاح و تجدید کا پورا کارنامہ ہی نہایت رفیع اور قابلِ قدر ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی مساعی کو عالمِ اسلام میں یورپ کی پوری تحریکِ احیاء العلوم (RENAISSANCE) کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن ان کا عظیم ترین

کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے توجہات کو از سرِ نو قرآنِ حکیم کے علم و حکمت کی جانب منعطف کر دیا۔ اور اللہ کی رسّی کے ساتھ اُمّتِ مسلمہ کے تعلّق کو دوبارہ اُستوار کرنے کی سعی کا آغاز کر کے گویا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس قول کے مطابق کہ "لَا یُصْلِحُ اٰخِرَ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِہٖ اَوَّلُھَا" اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی سعی و جہد کی راہ کھول دی ــــ! فَجَزَاہُ اللّٰہُ اَحْسَنَ الْجَزَاءِ!!

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی قرآنی خدمات پر جو جامع تبصرہ شیخ محمد اکرم مرحوم نے اپنی تالیف 'رودِ کوثر' میں کیا ہے وہ ہدیۂ قارئین کر دیا جائے۔ وَھُوَ ھٰذَا:

"آپ کا سب سے اہم کام قرآن اور عُلومِ قرآنی کی اشاعت ہے اور اس سلسلے میں آپ کا بڑا کارنامہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ہے۔ ہندوستان میں بہت کم لوگ عربی جانتے تھے۔ دفتری اور تعلیمی زبان فارسی تھی لیکن اس زبان میں قرآنِ مجید کا کوئی ترجمہ رائج نہ تھا[1]۔ چنانچہ عام تعلیم یافتہ مسلمان گلستان، بوستان، سکندر نامہ اور شاہنامہ تو پڑھتے اور سمجھتے، لیکن قرآن مجید سے جو ہدایات کا سرچشمہ ہے، ناواقف رہتے۔ پرانے علماء اور خواص میں سے قرآن مجید اگر کسی نے پڑھا تو ناظرانہ یعنی مفہوم و معانی سمجھنے اور اُس کی رُوح و تعلیمات سے فیضیاب ہونے کے بغیر۔ اکبر کے دربار میں جب مسلمان عُلماء اور پرتگیز مشنریوں میں مباحثے ہوئے اور مشنریوں نے (جو کلامِ مجید کے لاطینی ترجمے کی وجہ سے اس کے اندراجات سے خوب واقف تھے) کلامِ مجید کے بعض حصّوں پر اعتراض کیے تو اس وقت پتہ چلا کہ جن مسلمانوں نے عربی میں قرآن پڑھا بھی تھا انہیں بھی اس کے مضامین اور اندراجات سے پُوری طرح واقفیت نہ تھی۔ بسا اوقات یہ ہوتا کہ پادری کلامِ مجید کے کسی بیان پر اعتراض کرتے اور مسلمان کہہ دیتے کہ یہ تو

---

[1] شیخ سعدی کا ایک ترجمہ بھی اب بازار میں ملتا ہے لیکن شیخ سعدیؒ سے اس کی نسبت مشتبہ ہے اور یقیناً یہ ترجمہ کبھی بھی رائج نہیں ہوا۔ شاہ صاحب سے پہلے ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے سلاطینِ جونپور کے زمانے میں ایک تفسیر بحرِ مواج لکھی تھی، جس میں ہر آیت کی تشریح و تفسیر سے پہلے اس کا ترجمہ دیا تھا لیکن ظاہر ہے اس ترجمے کی حیثیت محض ضمنی اور جزوی تھی اور اُسے کبھی بھی عام مقبولیت نصیب نہ ہوئی۔

قرآن میں ہے ہی نہیں اور پھر جب کلام مجید کھول کے دیکھا جاتا تو وہ حوالے نکلتے۔ شاہ صاحب کو اس بُوالعجبی کا احساس ہوا اور حج سے واپس آنے کے پانچ سال بعد ۱۷۳۸-۳۹ء میں آپ نے فارسی زبان میں کلام مجید کا ترجمہ کیا۔ جب علماء کو اس کا پتا چلا تو تلواریں کھینچ کر آ گئے کہ یہ کلام مجید کی انتہائی بے ادبی ہے بعض سوانح نگار لکھتے ہیں کہ اس مخالفت کی وجہ سے شاہ صاحب کی جان اس طرح خطرے میں پڑ گئی کہ انہیں کچھ عرصہ کے لیے دہلی سے چلے جانا پڑا۔ لیکن بالآخر شاہ صاحب کی جرأت اور فرض شناسی کامیاب ہوئی۔ انہوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ کلام اللہ اس لیے نہیں آیا کہ اسے ریشمی جزدانوں میں لپیٹ کر طاق پر تبرکاً رکھا جائے یا جس طرح دوسری قومیں منتر پڑھا کرتی ہیں، ہم اسے طوطے کی طرح بغیر سمجھے پڑھ دیں۔ یہ کتاب انسانی زندگی کے متعلق اہم ترین حقائق کو بے نقاب کرتی ہے۔ اس کے نازل ہونے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اسے پڑھیں اور ان حقائق کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائیں اور اس کے لیے رائج الوقت زبانوں میں اس کا ترجمہ ضروری ہے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ معترضین کی مخالفت کم ہوئی اور نہ صرف شاہ صاحب کے ترجمے نے رواج پایا، بلکہ اُردو اور دوسری زبانوں کے ترجموں کی راہ پیدا ہو گئی۔

قرآن مجید کا محض ترجمہ کر دینا ہی اس قدر اہم کام تھا کہ اگر شاہ صاحب فقط اسی کارِ خیر پر اکتفا کرتے اور وہ ابتدائی دشواریاں دُور کر دیتے جو عام علما کی فرض ناشناسی اور کورانہ تقلید کی وجہ سے ان کے راستے میں حائل تھیں، تب بھی اسلامی تاریخ میں ان کا نام درخشاں ستارے کی طرح چمکتا، لیکن ان کا ترجمہ بطورِ خود بلند پایہ اور قابلِ قدر و عظمت ہے۔ ترجمے کی مخالفت بیشتر تو تقلید اور اُمورِ مذہب میں مغز کو چھوڑ کر استخوان کے پیچھے دوڑنے کی وجہ سے تھی، لیکن اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید کے ترجمے میں ہزاروں دقتیں ہیں۔ ترجمے میں لفظی صحت کو برقرار رکھنا اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن کے بلیغ معانی اور اُس کی ادبی شان کو اس پر قربان نہ ہونے دینا اس قدر مشکل ہے کہ آج، جبکہ ہمیں قرآن مجید کے ترجموں میں دو سو سال کی مشق ہے اور قوم کے بہترین علما و ادبا نے اس قومی خدمت پر توجہ کی ہے، ایک بھی ترجمہ ایسا نہیں، جسے تسلی بخش کہا جا سکے یا جس سے اصل کے زورِ بیان، فصاحت و بلاغت

اور روحانی عظمت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ شاہ ولی اللہؒ کے ترجمے کے متعلق یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے بہتر ترجمہ نہیں ہو سکتا اور اصل میں ضرورت یہ ہے کہ مستند اور بلند پایہ ترجمے کے لیے علماء اور اہلِ قلم کی ایک پوری جماعت یہ فرض ادا کرے لیکن اکثر باتوں میں وہ موجودہ اردو ترجموں سے کہیں بہتر ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید کا ترجمہ کرنے والے میں جن خصوصیتوں کی ضرورت ہے وہ شاہ صاحب سے بڑھ کر آج تک کسی مترجم میں جمع نہیں ہوئیں۔ مولانا نذیر احمد کہتے ہیں "فی الحقیقت قرآن کے مترجم ہونے کے لیے جتنی باتیں درکار تھیں، ترجمے سے ثابت ہوتا ہے وہ سب مولانا شاہ ولی اللہؒ میں علیٰ وجہ الکمال پائی جاتی تھیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ مولانا صاحبؒ کی نظر تفاسیر اور احادیث اور دین کی کتابوں پر ایسی وسیع ہے کہ بس انہیں کا حصہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک آیت بلکہ ہر ایک لفظ کی نسبت مفسرین کے جتنے اقوال ہیں وہ سب ان کے پیشِ نظر ہیں اور وہ ان میں جس کو واضح پاتے ہیں اُسے اختیار کرتے ہیں۔"

شاہ صاحبؒ نے نہ صرف قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ بلکہ اس مسئلے کے علمی پہلوؤں پر بھی ایک رسالہ لکھا اور مقدمہ فی ترجمۃ القرآن المجید میں قرآن مجید کے مترجموں کی رہنمائی کے لیے کارآمد ہدایتیں درج کیں۔

شاہ صاحبؒ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں "اس بندۂ ضعیف پر خداوند تعالےٰ کی کئی بے شمار نعمتیں ہیں، جن میں سب سے زیادہ عظیم الشان نعمت یہ ہے کہ اس نے مجھ کو قرآن مجید سمجھنے کی توفیق عطا فرمائی اور حضرت رسالت مآب کے احسانات اس کمترین اُمت پر بہت ہیں، جن میں سب سے بڑا احسان قرآن مجید کی تبلیغ ہے۔"

قرآن مجید کی تبلیغ شاہ صاحب نے فقط ترجمہ کر کے ہی نہیں کی، بلکہ علمِ تفسیر کے متعلق کتابیں بھی لکھیں۔ جن میں الفوز الکبیر فی اُصول التفسیر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس کتاب کے چار باب ہیں، جن میں علومِ قرآنی اور مطالعۂ قرآن کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کیا ہے۔ دوسرے باب میں آپ نے مسئلۂ نسخ پر مجتہدانہ انداز سے نظر ڈالی ہے اور وہ آیاتِ منسوخہ جن کی تعداد بعض لوگوں کے نزدیک پانچ سو کے قریب تھی اور جن کی

تعداد علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے بھی بیس مقرر کی تھی، چار سے زیادہ تسلیم نہیں کیں۔

فوز الکبیر کے بعض اندراجات سے خیال ہوتا ہے کہ شاہ صاحب قرآنی ارشادات کو وسیع سے وسیع مفہوم دینا چاہتے تھے۔ وہ مختلف آیتوں اور سورتوں کے متعلق اسبابِ نزول کا خیال رکھتے ہیں، لیکن اس بات کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ اس سے کلامِ مجید کے اصلی مقصد پر پردہ نہ پڑ جائے۔ چنانچہ باب اول میں لکھتے ہیں۔ (ترجمہ)

"عام مفسرین نے ہر ایک آیت کو خواہ مباحثہ کی ہو یا احکام کی، ایک قصے کے ساتھ ربط دیا ہے اور اس قصے کو اس آیت کے لیے سببِ نزول مانا ہے لیکن حق یہ ہے کہ نزولِ قرآنی سے مقصودِ اصلی نفوسِ بشریہ کی تہذیب اور اُن کے باطل عقائد اور فاسد اعمال کی تردید ہے اس لیے آیاتِ مناظرہ کے نزول کے لیے متکلمین میں عقایدِ باطلہ کا وجود اور آیاتِ احکام کے لیے ان میں اعمالِ فاسدہ اور مظالم کا شیوع اور آیاتِ تذکیر کے نزول کے لیے ان کا بغیر ذکر آلاء اللہ و ایام اللہ اور موت و واقعات بعد الموت کے بیدار نہ ہونا، اصلی سبب ہوا۔ خاص واقعات کو جن کے بیان کرنے کی زحمت اٹھائی گئی ہے اسبابِ نزول میں چنداں دخل نہیں۔ مگر سوائے چند آیات کے جن میں کسی ایسے واقعہ کی جانب اشارہ ہے جو رسول اللہ کے زمانے میں یا اس سے پیشتر واقع ہوا ہو۔"

فوز الکبیر کی دوسری خصوصیت شاہ صاحب کی انصاف پسندی اور اخلاقی جرأت ہے مثلاً عام طور پر مسلمان زمانۂ جاہلیت کے عربوں سے فقط برائیاں اور عیب ہی منسوب کرتے ہیں لیکن شاہ صاحب نے اس معاملے میں بھی "انصاف بالائے طاعت" کے اصول کو ملحوظ رکھا اور تصویر کے دونوں پہلو پیش کیے۔ اسی طرح عام مسلمانوں کا خیال ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی اصل مذہبی کتاب کو بدل ڈالا ہے لیکن شاہ ولی اللہؒ اس کے قائل نہ تھے۔ وہ لکھتے ہیں "یہودی تحریفِ لفظی، تورات کے ترجمے وغیرہ میں کیا کرتے تھے نہ کہ اصل کتاب میں کیونکہ فقیر کے نزدیک ایسا ہی محقق ہوا ہے اور ابن عباسؓ کا بھی یہی قول ہے۔"

بعض مفسرین نے اہل کتاب سے قصے لے کر انہیں قرآنی تفاسیر اور علوم اسلامی

کا جزو بنا دیا ہے۔ اس کے خلاف شاہ صاحب نے جا بجا آواز بلند کی ہے مثلاً فوز الکبیر میں لکھا ہے "یہاں پر یہ جان لینا مناسب ہے کہ حضرت انبیاءِ سابقین کے قصّے احادیث میں کم مذکور ہیں اور ان کے وہ لمبے چوڑے تذکرے جن کے بیان کرنے کی تکلیف عام مفسّرین بیان کرتے ہیں وہ سب اِلّا مَاشَآءَ اللہُ علماءِ اہلِ کتاب سے منقول ہیں" اسی کتاب میں آگے چل کر پھر لکھتے ہیں "اسرائیلی روایات کا نقل کرنا ایک ایسی بلا ہے جو ہمارے دین میں داخل ہو گئی ہے۔ حالانکہ صحیح اصول یہ ہے کہ اُن کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب" مفسّرین کے بعض قصّے جنہیں عوام اسلام کا ضروری جُزو سمجھنے لگ گئے ہیں، شاہ صاحب کو بہت ناپسند تھے۔ فرماتے تھے" اور محمد بن اسحاق و اقدی کلبی نے قصّہ آفرینی میں جس قدر افراط کی ہے (یعنی وہ ہر ایک آیت کے تحت میں ایک قصّہ لائے ہیں) محدّثین کے نزدیک اُن کا اکثر حصّہ صحیح نہیں اور ان کے اسناد میں خامیاں ہیں۔ ان لوگوں کی اس افراط کو علمِ تفسیر کے لیے شرط سمجھنا صریح غلطی اور اس کے حفظ پر فہمِ کتابُ اللہ کو موقوف کرنا در اصل کتابُ اللہ سے اپنا حصّہ کھونا ہے"

مفسّرین کی یہی ژولیدہ نویسی تھی جس کی وجہ سے شاہ صاحب نے اپنے وصیت نامے میں بھی لکھا کہ قرآن اور اس کا ترجمہ تفسیر کے بغیر ختم کرنا چاہیے۔ اور پھر اس کے بعد تفسیر، اور وہ بھی تفسیرِ جلالین (بقدرِ درس) پڑھائی جائے۔ (جو نہایت مختصر ہے اور جس کے الفاظ قرآن کے الفاظ جتنے ہیں) وہ لکھتے ہیں "قرآنِ عظیم اس طرح پڑھاویں کہ صرف قرآن اور ترجمہ بغیر تفسیر کے پڑھا جائے مگر جہاں شانِ نزول یا قاعدۂ نحو مشکل ہو وہاں ٹھہر جائیں اور بحث کریں بعد اس کے تفسیرِ جلالین بقدرِ درس پڑھاویں" (ترجمہ)

باب سوم

انگریزی دَور کے نئے فِتنوں کا سدِّ باب

تحریکِ

رجُوع اِلیَ القرآن

اور

ترجمہ و تفسیر قرآن کے مختلف مکاتبِ فکر

- خانوادۂ ولی اللّٰہیؒ اور تحریکِ شہیدینؒ
- عیسائیوں اور ہندوؤں کی جانب سے تبلیغی یلغار
- سرسید احمد خاں مرحوم اور آنجہانی غلام احمد قادیانی
- شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
- ڈاکٹر سر محمد اقبال اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین
- مولانا ابوالکلام آزاد اور سید ابوالاعلیٰ مودودی
- امام حمید الدین فراہیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بارے میں ہم اپنا یہ تأثر بھی بیان کر چکے ہیں کہ "دورِ صحابہؓ کے بعد کی پوری اسلامی تاریخ میں اُن کی سی جامعیّتِ کبریٰ کی حامل کوئی دوسری شخصیّت نظر نہیں آتی اور اس میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ واقعۃً دورِ جدید کے فاتح ہیں۔ ۔ ۔ ۔" اور ساتھ ہی تجدید دین اور احیائے اسلام کے بلند و بالا مقاصد کے لیے اُن کی ہمہ جہتی مساعی کا ایک اجمالی خاکہ بھی بیان کیا جا چکا ہے اور یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ ان مختلف النّوع اور وسیع الاطراف مساعی میں ان کی اہم ترین خدمت یہ تھی کہ انہوں نے "اسلام کا رشتہ اس کی اصل ثابت یعنی قرآنِ حکیم کے ساتھ از سرِ نو قائم کرنے کے طویل عمل کا باقاعدہ آغاز فرما دیا" ——— اور یہ کہ "ان کا عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے توجّہات کو از سرِ نو قرآنِ حکیم کے علم و حکمت کی جانب منعطف کر دیا ——— اور اللہ کی رسّی کے ساتھ اُمّتِ مسلمہ کے تعلّق کو دوبارہ استوار کرنے کی سعی کا آغاز کر کے گویا حضرت ابوبکر صدّیقؓ کے اس قول کے مطابق کہ "لا یصلح آخر ھذہ الامّۃ الّا بما صلح بہ اولھا" اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی سعی و جہد کی راہ کھول دی"!

اس سے پہلے ہم یہ بھی واضح کر چکے تھے کہ صدرِ اوّل میں اسلام کی عظیم ترین حقیقتیں دو ہی تھیں: ایک ایمان ——— وہ ظاہری اور قانونی و فقہی ایمان نہیں جس کا تعلّق "اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ" سے ہے بلکہ وہ حقیقی اور قلبی ایمان جو یقین بن کر انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جائے ——— اور دوسرے جہاد فی سبیل اللہ جس کا مقصد ہو "شہادت علی النّاس" ——— "اعلاءِ کلمۃ اللہ" اور "اظہارِ دینِ حق علی الدّین کلّہٖ" ——— اور چونکہ ایمانِ حقیقی کا منبع و سرچشمہ ہے قرآنِ حکیم اور جہاد و قتال کی علامت ہے تلوار، لہٰذا "مردِ مومن" کی شخصیّت کا جو ہیولیٰ چشمِ تصوّر کے سامنے اُبھرتا ہے اُس کے ایک ہاتھ میں بالکل بجا طور پر قرآن ہوتا ہے اور دوسرے میں تلوار!

یہ صحیح ہے کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی اپنی زندگی میں سر بکف، سیف بدست اور کفن بر دوش میدانِ جہاد و قتال میں نکلنے کا مرحلہ نہیں آیا لیکن یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ان کی وفات کے نصف صدی کے اندر اندر جہاد و قتال فی سبیل اللہ کا جو غلغلہ سرزمینِ ہند میں بلند ہوا وہ تمام تر اُن ہی کی تجدیدی دعوت کی صدائے بازگشت تھی۔ اس لیے کہ خود حضرت سیّد احمد بریلویؒ بھی خانوادۂ ولی اللّٰہی ہی کے تربیت یافتہ تھے اور اُن کے دستِ راست تو تھے ہی شاہ اسمٰعیلؒ ابن شاہ عبدالغنیؒ ابن شاہ ولی اللہؒ۔ اور اگرچہ انجامِ کار کے اعتبار سے ہندوستان کی یہ پہلی اسلامی تحریک "شعلۂ مستعجل" کا مصداق بن گئی لیکن اس کی خوش درخشیدگی، یقیناً ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ یہاں تک کہ واقعہ یہ ہے کہ اس تحریکِ جہاد کے وابستگان کے ایمان و یقین، ذوق و شوق اور جوش و خروش کے تذکرے سے بے اختیار صحابہ کرامؓ یاد آجاتے ہیں اور سخت حیرت ہوتی ہے کہ "ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی!" اور یہ ایک بیّن ثبوت ہے اس کا کہ اگر دعوت کی اساس اور منہجِ عمل وہی اختیار کیا جائے جو اسلام کے صدرِ اوّل میں کیا گیا تھا تو سیرت و کردار کے وہی نمونے آج بھی تیار ہو سکتے ہیں جو دورِ صحابہؓ کا طرۂ امتیاز ہیں، گویا بقول جگر مرادآبادی ؎

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

ہندوستان میں انگریز کے باقاعدہ عسکری تسلّط کا آغاز تو ۱۷۵۷ء میں جنگِ پلاسی کے نتیجے میں گویا شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی زندگی ہی میں (ان کی وفات سے چھ سال قبل) ہو گیا تھا تاہم اسے ایک باضابطہ کُل ہند سلطنت بننے میں پوری ایک صدی لگی۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کے غدر یا بغاوت کی صورت میں آخری ہچکی لے کر ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا ساڑھے چھ صد سالہ دور ختم ہو گیا۔ اور تاریخِ ہند کے برطانوی دور کا آغاز ہو گیا۔

اٹھارویں صدی عیسوی کا نصفِ آخر اور انیسویں صدی کا نصفِ اوّل ہند میں سخت اضطراب و انتشار اور شکست و ریخت کا زمانہ ہے جس میں مسلمان بالخصوص صد درجہ مایوسی اور دل شکستگی کا شکا

رہے۔ مایوسی کے اس غلبے میں جب کہ حالت یہ ہوتی ہے کہ ؎

آرزُو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
اور ہو جائے تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام

ظاہر ہے کہ تحریکِ شہیدینؒ ایسی پُرعزیمت دعوت کا پنپنا اور کامیاب ہونا آسان نہ تھا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ ۱۸۳۱ء میں شہیدینؒ نے "بخاک و خون غلطیدن" کی روش اختیار کرلی اور اپنے بہت سے رفقاء کے ساتھ جامِ شہادت نوش کرلیا اور اس طرح بالاکوٹ کی فضاؤں میں دعوتِ ولی اللّٰہی کی یہ پہلی صدائے بازگشت دم توڑ گئی ——— اور بعد میں اگرچہ مجاہدین مسلسل ع

"من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را!"

پر عمل پیرا رہے اور ان کی مساعی کا سلسلہ بالآخر ریشمی رُومالوں کی تحریک تک ممتد ہوا لیکن ظاہر ہے کہ اُن کا نتیجہ کوئی برآمد نہ ہوسکا ——— اور ہندوستان میں انگریز کا اقتدار اور قبضہ دن بدن مستحکم ہوتا چلا گیا

برطانوی دَور میں مسلمانانِ ہند زندگی اور موت کی جس کشمکش سے مسلسل دوچار رہے اس کے متعدّد پہلو تھے، خالص دینی و مذہبی بھی، علمی و فکری بھی، سماجی و مجلسی بھی، اور قومی و سیاسی بھی ——— ان میں سے اس وقت ہماری گفتگو خالص دینی و مذہبی کشمکش تک محدود ہے (قومی و سیاسی کشمکش کے بارے میں ہم نے ۱۹۶۷ء میں ان ہی صفحات میں تفصیل کے ساتھ اظہارِ رائے کیا تھا، یہ مضامین اسلام اور پاکستان کے زیرِ عنوان کتابی صورت میں شائع کیے جا چکے ہیں) ——— مزید برآں یہ چومکھی جنگ مسلمانوں کو بیک وقت دو دشمنوں سے لڑنی پڑی، انگریزوں سے بھی اور ہندوؤں سے بھی! اور جیسا کہ بالعموم ہوتا ہے اس میں اوّلاً مسلمانوں کو مدافعت ہی پر اکتفا کرتے بنی اور ایک طویل عرصے بعد ہی یہ صورت پیدا ہوسکی کہ قدم جما کر کسی مثبت اساس پر تعمیرِ جدید کی کوشش شروع کرسکیں۔

خالص مذہبی میدان میں مسلمانوں کو سب سے پہلے عیسائی مشنریوں کی یلغار سے سابقہ پیش آیا۔ ۱۸۲۶ء میں ہیبر (HABER) لارڈ بشپ آف کلکتہ نے براستہ دہلی بمبئی تک پورے

ہندوستان کا دورہ کرنے کے بعد اعلان کیا کہ ہم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ مسلمانانِ ہند میں نہ کوئی مذہبی جذبہ باقی رہا ہے نہ سیاسی قوّت۔ لہٰذا عیسائیوں کو کھل کر اپنے مذہب کی تبلیغ کرنی چاہیے۔ چنانچہ عیسائی پادری چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے اور نوبت بایں جا رسید کہ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر بھی عیسائیت کی تبلیغ ہونے لگی۔ تب وہی سُنّتِ الٰہی ظاہر ہوئی کہ ؎

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسےٰ طلسمِ سامری!

اور یہ سعادت اُسی خطّے کے حصّے میں آئی جس میں علم و حکمتِ ولی اللّٰہی کے چشمے بہہ رہے تھے کہ ضلع مظفر نگر کے قصبے کیرانہ سے مولانا رحمت اللہ نامی شخصیت اُبھری جس نے پادری فینڈر (FANDER) کی کتاب "میزان الحق" کا دندان شکن اور مُسکت جواب "اظہار الحق" کے نام سے تحریر کیا۔ نتیجۃً پادری صاحب موصوف کو ہندوستان سے دُم دبا کر بھاگتے ہی بنی ——— (اور پھر جب اس نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز ترکی کو بنایا اور وہاں کے علماء کا ناک میں دم کر دیا اور وہاں سے طلبی پر مولانا رحمت اللہ کیرانوی ترکی پہنچے تو وہاں سے بھی نو دو گیارہ ہو گیا) مباحثے اور مناظرے میں اِس شکستِ فاش کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعد میں ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ کھلے میدان میں خم ٹھونک کر کبھی نہ کی جا سکی۔ اور اس کی واحد ممکن صورت صرف یہ رہ گئی کہ پسماندہ طبقات کی تالیفِ قلب کے ذریعے کچھ لوگوں کے ناموں کے آگے چپکے سے 'مسیح' کا لاحقہ چسپاں کرا دو اور بس!

دوسری طرف عیسائی پادریوں کے دیکھا دیکھی ہندوؤں کی باسی کڑھی میں بھی اُبال آ گیا اور مسلمانوں پر اُن کا تبلیغی حملہ دو صورتوں میں ہوا: ایک خالص رجعتی اور تنگ نظرانہ انداز میں، دوسرے قدرے وسیع المشربی کے رنگ اور ترقی پسندانہ انداز میں ——— ان میں سے پہلے کا حشر تو اگرچہ عیسائی مشنریوں کے انجام جیسا ہی ہوا لیکن جس طرح کوئی بخار جاتے جاتے مریض کے لیے کوئی اذیت بخش چیز چھوڑ جاتا ہے جیسے عام گھریلو زبان میں بخار کا "موتنا" کہتے ہیں اسی طرح یہ فتنہ بھی جاتے جاتے جسدِ ملّت میں ایک سرطان کی جڑیں جما گیا ——— رہا دوسرے انداز کا حملہ تو اُس نے میٹھی چھری والا کام کیا اور مسلمانانِ ہند کے اچھے بھلے حصّے کو متأثر کیا یہاں تک کہ بعض انتہائی اہم شخصیتیں بھی اس کی زُلفِ گرہ گیر کی اسیر ہو گئیں۔

اوّل الذکر حملہ ـــــ آریہ سماجیوں کی جانب سے تھا جنہوں نے ۱۸۶۵ء ہی کے لگ بھگ مسلمانوں کو للکارنا شروع کر دیا تھا اور ۱۸۷۵ء میں سوامی دیانند سرسوتی کی تصنیف "ستھیارتھ پرکاش" کی اشاعت سے تو گویا یہ فتنہ عروج کو پہنچ گیا تھا۔ اِن کے جواب کے لیے علماءِ حق بھی میدان میں آئے لیکن بدقسمتی سے اس میدان میں نمایاں حیثیّت آنجہانی غلام احمد قادیانی کو حاصل ہوگئی جس نے ۱۸۸۳ء میں اپنی تالیف "سُرمہ چشم آریہ" ہی کے ذریعے وہ ہر دلعزیزی حاصل کی تھی جو اس کے ظرف سے بہت زیادہ ہونے کے باعث چھلک پڑی۔ نتیجۃً وہ خود بھی گمراہ ہوا اور دوسرے سینکڑوں اور ہزاروں کو بھی گمراہ کر گیا۔

مؤخّر الذکر حملہ ـــــ برہمو سماج کی صورت میں سامنے آیا جس کی تأسیس ۱۸۱۶ء میں راجہ رام موہن رائے (ولادت ۱۷۷۰ء، وفات ۱۸۳۳ء) نے کی تھی۔ عجیب بات ہے کہ یہ انتہائی ذہین و فطین اور عالم و فاضل شخص بھی پہلے اسلام اور مسلمانوں کی جانب سے مدافعت کرتے ہوئے ہی سامنے آیا۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کو عیسائی مشنریوں کے حملے سے بچانے کے لیے "تحفۃ الموحّدین" تصنیف کی اور اس طرح مسلمانوں میں ہر دلعزیزی حاصل کر لی۔ بعد میں یہ شخص اپنشدوں کا پرچارک، ہندوستان کی عظمت و سطوتِ پارینہ کا نقیب اور ہندی نیشنلزم کا علمبردار بن کر سامنے آیا۔ اور مسلمانانِ ہند کے دلوں میں نرم گوشہ پیدا کرنے کے لیے اس نے اکبرِ اعظم علیہ ما علیہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے 'دینِ الٰہی' کے چربے کے طور پر 'وحدتِ ادیان' کا فلسفہ ایجاد کیا۔ جس کے ناوک نے اچھے اچھوں کو زخمی کیا اور بڑے بڑوں کے دلوں کو چھید ڈالا۔ واقعہ یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس کی پوری تحریک اسی ایک شخص کے ظلّ اور بروز کی حیثیّت رکھتی ہے اور گاندھی جی کی شخصیّت پر سب سے گہری چھاپ اسی کی نظر آتی ہے۔ عجیب مماثلت ہے کہ جس طرح راجہ جی نے اسلام اور مسلمانوں کی مدافعت میں "تحفۃ الموحّدین" تالیف کی اسی طرح گاندھی جی نے مسلمانوں کی تالیفِ قلب کے لیے تحریکِ خلافت میں شمولیّت اختیار کی اور وحدتِ ادیان کے فلسفے کو اتنا اُچھالا کہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم جیسی عظیم اور نابغہ شخصیّت بھی اس کی زلفِ گرہ گیر کی اسیر ہوگئی ؎

"ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں"

مسلمانانِ ہند کی مثبت احیائی مساعی کا آغاز دراصل بیسویں صدی عیسوی کی ابتدا سے ہوا۔

یہ مساعی قومی و ملّی سطح پر اور خالص سیاسی میدان میں بھی ہوئیں اور علمی و فکری سطح پر بھی۔ ہم مختلف مواقع پر اس احیائی عمل کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ رائے کر چکے ہیں۔ آج ہمیں اس ہمہ جہتی عمل کے اُس پہلو پر روشنی ڈالنی ہے جو ہمارے نزدیک خالص تجدید و احیائے دین اور ٹھیٹھ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے اعتبار سے اہم ترین ہے ——— اور وہ یہ کہ بحمد اللہ نگاہوں کا ارتکاز رفتہ رفتہ قرآن مجید پر ہوتا جا رہا ہے اور اُمّتِ مسلمہ جو کلام اللہ سے بالکل بیگانہ ہو گئی تھی دوبارہ اس کی طرف متوجّہ ہو رہی ہے۔

اس عمل کا آغاز جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، اٹھارویں صدی میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے قرآن مجید کے فارسی ترجمے اور "الفوز الکبیر فی اُصول التفسیر" کی تالیف سے کیا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں اُن کے دو صاحبزادوں، شاہ رفیع الدینؒ، اور شاہ عبدالقادرؒ کے علی الترتیب لفظی و بامحاورہ اُردو ترجمے شائع ہوئے (شاہ رفیع الدینؒ کا ۱۸۰۵ء میں اور شاہ عبدالقادرؒ کا ۱۸۱۰ء میں) ——— انیسویں صدی کا اکثر حصّہ اگرچہ سیاسی شکست و ریخت اور عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کے ساتھ مباحثوں اور مناظروں میں بیت گیا تاہم اس کے اواخر ہی میں "رُجُوع اِلَی القرآن" کا وہ عمل پھر شروع ہو گیا تھا جو بیسویں صدی کے اوائل میں پوری شدّت کو پہنچا۔

رُجُوع اِلی القرآن کے اِس عمل کا جائزہ لیتے ہوئے یہ امر پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ آغازِ کار میں اِس میں اُن گروہوں نے بھی حصّہ لیا جو بعد میں انتہائی غلط راہوں پر چل نکلے اور ضَلُّوا وَ اَضَلُّوا کا مصداقِ کامل بن گئے۔ ان میں وہ بھی ہیں جو "ضَلُّوا ضَلٰلًا بَعِیْدًا" کی اُس حد کو پہنچ گئے کہ اُمّت کو مجبوراً ان کا تعلّق اپنے سے منقطع کرنا پڑا جیسے قادیانی، اور وہ بھی ہیں جن کی یا تو گمراہی اس درجے کی نہ تھی یا اہمیّت اتنی نہ تھی کہ یہ انتہائی قدم اٹھایا جاتا جیسے چکڑالوی و پرویزی ——— تاہم چونکہ انہوں نے بھی قرآنِ حکیم کی جانب ارتکازِ توجّہ کے عمل میں صحیح یا غلط طور پر کچھ حصّہ لیا ہے لہٰذا اُن کا ذکر کیا جا رہا ہے ——— اِسے کسی بھی درجے میں ان کی تائید کے مترادف نہ سمجھا جائے۔

سب سے پہلے تو اندازہ کرنا چاہیے کہ گزشتہ صدی کے ربعِ آخر اور موجودہ صدی کے ربعِ اوّل میں ترجمہ و تفسیرِ قرآن کے ذیل میں برّصغیر پاک و ہند میں کس قدر کام ہوا:

(۱) سب سے پہلے سرسیّد احمد خاں مرحوم نے ۱۸۷۵ء میں اپنے ہفت روزہ اخبار 'تہذیبُ الاخلاق' میں تفسیرِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا جو گیارہ سال میں پندرہ پاروں تک پہنچ کر رُک گیا۔

(۲) ۱۹۰۳ء میں ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ترجمہ شائع ہوا۔

(۳) ۱۹۰۶ء میں مرزا حیرت دہلوی کا ترجمہ شائع ہوا۔

(۴) ۱۹۱۰ء میں مولوی فتح محمد جالندھری کا ترجمہ شائع ہوا۔

(۵) ۱۹۰۵ء میں مولوی عبداللہ چکڑالوی کی تفسیر شائع ہوئی۔

(۶) ۱۹۱۱ء میں مرزا ابوالفضل ایرانی (شیعہ) نے انگریزی میں ترجمہ شائع کیا۔ اس کو دیکھ کر نواب عماد الملک بلگرامی نے اس سے بہتر ترجمہ شروع کیا لیکن سولہ پاروں تک ہی پہنچ پائے تھے کہ فوت ہوگئے۔ لہٰذا یہ نامکمل رہ گیا اور شائع نہ ہوسکا۔

(۷) ۱۹۰۶ء میں مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تفسیر بیان القرآن لکھنی شروع کی جو ۱۹۱۵ء میں مکمل ہوئی۔

(۸) ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی کا ترجمہ مع مختصر حواشی شائع ہوا (حواشی سورۃ النساء تک حضرت شیخ الہندؒ کے ہیں اور باقی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے)

(۹) ۱۹۱۷ء میں محمد علی لاہوری کا انگریزی ترجمۂ قرآن مع مختصر حواشی شائع ہوا۔ اسے اس قدر شہرت حاصل ہوئی کہ ۱۹۲۰ء تک کُل تین برس میں اس کے تیس ہزار نسخے فروخت ہوگئے!)

(۱۰) ۱۹۲۲ء میں محمد علی لاہوری ہی کی اُردو تفسیر شائع ہوئی، اس کا نام بھی 'بیان القرآن' ہی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ فہرست کسی طرح بھی مکمل نہیں کہلا سکتی، تاہم اس سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ قرآن مجید کے ساتھ اعتناء و التفات کا ایک سلسلہ گذشتہ صدی کے اواخر سے شروع ہوگیا تھا اور اس صدی کے رُبعِ اوّل کے ختم ہونے تک خاصی دلچسپی مسلمانانِ ہند کو قرآنِ حکیم اور اس کے عُلوم و معارف کے ساتھ پیدا ہوچکی تھی۔

ہم اس سے قبل ایک موقع پر قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ برصغیر پاک و ہند میں ملّتِ اسلامی کی نشاۃِ ثانیہ کے عمل کے دوران دو متضاد نقطۂ نظر اور طرزہائے فکر پروان چڑھتے گئے۔ ایک وہ جس کا منبع و سرچشمہ علی گڑھ بنا اور دوسرے وہ جس کے مرکز و محور کی حیثیت دیوبند کو حاصل ہوئی۔ ابتدا میں راسخ العقیدہ علماء کی گرفت مسلم معاشرے پر اتنی مضبوط تھی کہ علی گڑھی طرزِ فکر کو اپنے لیئے راستہ بنانے میں شدید مخالفت و مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا لیکن بعد میں حالات کے تقاضوں کے تحت اُس کے اثرات وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے گئے اور علماء کا حلقۂ اثر سکڑتا چلا گیا۔ تاہم اب بھی ہمارے جسدِ ملّی کے بحرِ محیط میں یہ دونوں رَوَیں بالکل مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۝ کی سی شان کے ساتھ بہہ رہی ہیں۔ اور اگرچہ قومی و سیاسی میدان میں علی گڑھی مکتبِ فکر کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی تاہم مذہبی میدان میں اب بھی غلبہ و اقتدار راسخ العقیدہ علماء ہی کو حاصل ہے!

اس تفرقہ و اختلاف کے جو اثرات ہماری قومی و سیاسی جِدّوجُہد پر مترتّب ہوئے وہ ہماری اِس وقت کی گفتگو کے موضوع سے خارج ہیں۔ اِس وقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ قرآن حکیم کی جانب توجّہ و التفات کا جو رُجحان پیدا ہوا اُس میں بھی یہ دونوں رنگ بالکل علیٰحدہ علیٰحدہ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ متذکرہ بالا تراجم و تفاسیر کو بنیادی طور پر دو گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک متجدّدانہ رنگ کی حامل تفاسیر جن کے ضمن میں سرسیّد احمد خاں مرحوم کی تفسیر کو اصلُ الاصُول کی حیثیّت حاصل ہے اور دوسری روایتی انداز کی راسخ العقیدہ تفاسیر جن میں حضرت شیخ الہندؒ کا ترجمہ اور مولانا تھانویؒ کی تفسیر بنیادی اور اساسی اہمیّت کی حامل ہیں۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر یا بالفاظِ دیگر "فکرِ قرآنی" کے میدان میں خواہ مولوی عبد اللہ چکڑالوی کی چکڑالویّت ہو خواہ محمد علی لاہوری کی لاہوریّت، اور خواہ علّامہ عنایت اللہ خاں المشرقی کی مشرقیّت ہو خواہ چودھری غلام احمد پرویز کی پرویزیّت، یہ سب فکرِ سرسیّد ہی کی شاخیں ہیں اور دوسری طرف مولانا تھانویؒ کی "بیان القرآن" پر مبنی تین مزید تفسیریں منصّہ شہود پر آ چکی ہیں۔ ایک مولانا عبدالماجد دریابادی کی تفسیر جس میں تقابلِ ادیان اور خصوصاً بائبل ہسٹری کے ضمن میں بہت مفید مباحث ہیں، دوسری مولانا محمّد ادریسؒ کاندھلوی کی تفسیر جس میں کلامی مسائل پر زیادہ

توجہ کی گئی ہے اور تیسری مولانا مفتی محمدؐ شفیع ؒ کی تفسیر جس میں فقہی مسائل سے زیادہ اعتناء کیا گیا ہے

جہاں تک مقدم الذکر مکاتبِ فکر کا تعلق ہے، ہمیں ان سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے اور ہم انہیں ضلالت وگمراہی ہی کے مختلف رنگ (SHADES) سمجھتے ہیں۔ بایں ہمہ اس جائزے میں اُن کا ذکر دو وجوہ سے کیا گیا ہے: ایک یہ کہ اُن کی مساعی سے بھی اُمت کے بعض عناصر میں قرآن مجید سے ایک دلچسپی پیدا ہوئی۔ اور اگرچہ اُن کے زیرِ اثر یہ دلچسپی غلط رُخ پر پڑ گئی، تاہم اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اگر قرآن حکیم کے حقیقی اور اصلی علوم و معارف پیش کیے جائیں تو ان مکاتبِ فکر سے منسلک لوگوں کو بآسانی راغب کیا جا سکتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ ان مکاتبِ فکر نے گویا ایک ’دعویٰ‘ (THESIS) کی شکل اختیار کر لی جس کے جوابِ دعویٰ (ANTI-THESIS) کے طور پر راسخ العقیدہ علماء کو ترجمہ وتفسیرِ قرآن کی جانب متوجہ ہونا پڑا اور اس طرح ایک بڑا ذخیرہ اردو تراجم و تفاسیر کا تیار ہو گیا۔ جس سے قرآنِ مجید کی جانب عوام کی توجہات کے انعطاف کا عمل تیز تر ہو گیا۔

ویسے یہ عرض کرنا غالباً خارج از محل شمار نہیں ہو گا کہ خود علماء کے حلقوں میں تا حال قرآنِ حکیم پر توجہ اس درجہ مرکوز نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیئے تھی۔ راقم الحروف نے ایک بار مولانا سید محمد یوسف بنوری مدظلہٗ سے دریافت کیا کہ اِس کا کیا سبب ہے کہ اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ پر تو ہمارے یہاں ضخیم تصانیف موجود ہیں لیکن اصولِ تفسیر پر کل دو مختصر رسالے ملتے ہیں ایک امام ابن تیمیہؒ کا اور دوسرا شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا ہے ——— اس کا جواب تو مولانا نے قدرے توقف کے بعد یہ دیا کہ اصل میں اصولِ فقہ کی کتابوں میں اصولِ تفسیر بھی زیر بحث آ جاتے ہیں لہٰذا علیحدہ تصانیف کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن جب میں نے دریافت کیا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ آپکے دار العلوم میں تخصص فی الحدیث کا شعبہ بھی ہے اور تخصص فی الفقہ کا بھی لیکن تخصص فی التفسیر کا شعبہ موجود نہیں ہے ؟ تو اس پر مولانا نے پوری فراخدلی کے ساتھ تسلیم فرمایا کہ یہ ہماری کوتاہی ہے! اسی طرح حیرت ہوتی ہے کہ حلقۂ دیوبند کے علماء کرام کے دلوں میں حضرت شیخ الہندؒ کا جو مقام و مرتبہ ہونا چاہیے اور فی الواقع ہے وہ اظہر من الشمس ہے لیکن اُن کی آخری نصیحتوں میں سے اہم ترین نصیحت جسے نقل فرمایا مفتی محمد شفیعؒ نے، اس پر عمل کہیں نظر نہیں آتا۔ اِلّا ما شاء اللہ

بہرحال علی گڑھ اور دیوبند کی ان دو انتہاؤں کے مابین ملّتِ اسلامیۂ ہند کے محیط میں 'فکرِ قرآنی' کے تین سوتے اور پھوٹے جنہیں مجموعی طور پر (SYNTHESIS) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ایک وہ جس کا منبع اور سرچشمہ بنے علاّمہ اقبالؒ مرحوم جو معروف و متداول معنوں میں تو نہ مترجمِ قرآن تھے نہ مفسّرِ قرآن۔ بلکہ اُن کی تعلیم بھی نہ کسی دارالعلوم میں ہوئی تھی، نہ جامعۂ اسلامیہ میں۔ اس کے برعکس وہ سکولوں اور کالجوں کے تعلیم یافتہ اور یورپی یونیورسٹیوں کے فیض یافتہ تھے۔ بایں ہمہ قرآنِ حکیم کی ترجمانی کے اعتبار سے اُن کا مقام یقیناً 'رومیٔ ثانی' کا ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے پورے اعتماد کے ساتھ مناجات بحضورِ سیّد المرسلینؐ میں یہ تک کہہ دیا کہ:

گر دلم آئینۂ بے جوہر است ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کُن ایں خیاباں رازِ خارم پاک کُن
روزِ محشر خوار و رُسوا کُن مرا بے نصیب از بوسۂ پا کُن مرا

چنانچہ اُن کے اشعار تو ایمان و یقین کے کیف و سُرور، محبّتِ الٰہی اور عشقِ رسولؐ کے سوز و گداز اور جذبہ و جوشِ ملّی سے مملو ہیں ہی، اُن کے خطبات بھی درحقیقت وقت کی اعلیٰ ترین فکری سطح پر مطالعۂ قرآنِ حکیم ہی کی ایک کوشش کا مظہر ہیں جس کے ذریعے علاّمہ مرحوم نے جدید ریاضیات و طبعیات اور فلسفہ و نفسیات کا رشتہ قرآنِ حکیم کی اساسی تعلیمات کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اِس کے بغیر دورِ حاضر میں دین و مذہب کی گاڑی کا آگے چلنا محالِ مطلق ہے۔

علاّمہ مرحوم کی اس فکری کاوش کے ضمن میں اُن کے معروف ہم نشینوں نے تو کوئی مزید کام نہیں کیا ـــــ البتہ ڈاکٹر رفیع الدّین مرحوم نے اس سلسلے میں خاصی وقیع خدمات سرانجام دیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک طرف قرآن اور علمِ جدید' نامی تالیف کے ذریعے بعض جدید اور اہم نظریوں اور فلسفوں جیسے ڈارون کا نظریۂ ارتقاء، فرائڈ کا نظریۂ جنس، مارکس کا نظریۂ جدلی مادّیت وغیرہ کا جائزہ قرآنِ حکیم کی روشنی میں لیا اور ان کے صحیح اور غلط اجزاء کی نشاندہی کی کوشش کی اور دوسری طرف "IDEOLOGY OF THE FUTURE" نامی تصنیف کے ذریعے علاّمہ مرحوم کے فلسفۂ خودی کو ایک مرتّب اور منظّم نظامِ فکر کی حیثیت سے واضح کیا اور ثابت کیا کہ نوعِ انسانی

کا مستقبل اسی نظریے کے ساتھ وابستہ ہے۔

(۲) برصغیر میں قرآنی فکر کا دوسرا دھارا مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی شخصیت سے پھوٹا جس پر فکر سے زیادہ دعوت کا رنگ غالب تھا۔ مولانا مرحوم مفسرِ قرآن کی حیثیت سے تو بہت بعد میں متعارف ہوئے اس لیے کہ 'ترجمان القرآن' کی جلد اوّل ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ شائع ہوئی تاہم اُن کی قرآن حکیم کی ترجمانی اور قیامِ حکومتِ الٰہیہ کے لیے دعوتِ جہاد کا ڈنکا برصغیر کے طول و عرض میں ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۶ء 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ذریعے بج چکا تھا۔ اور اس ضمن میں وہ حضرت شیخ الہندؒ ایسی عظیم شخصیت تک سے خراجِ تحسین وصول کر چکے تھے۔ افسوس ہے کہ ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۱ء میں جب بعض علماء کی مخالفت کے باعث مولانا مرحوم 'امام الہند' کے منصب پر فائز ہوتے ہوتے رہ گئے تو ایک شدید ردِّعمل اُن کی طبیعت میں پیدا ہوا اور وہ ع

"یہ صُور پھُونک کر تم سو گئے کہاں آخر؟"

کے مصداق اس راہ ہی کو تج کر انڈین نیشنل کانگرس کی بھُول بھُلیّوں میں گم ہو کر رہ گئے اور اس طرح کم از کم عارضی طور پر برصغیر میں قرآنی فکر کے اس دھارے کے سوتے خشک ہو گئے! (مزید افسوسناک امر یہ کہ گاندھی جی کی شخصیت کے زیرِ اثر مولانا مرحوم 'وحدتِ ادیان' کے بھی پرچارک بن گئے۔ اور اس طرح گویا 'برہمو سماج' کی تقویت کا ذریعہ بن گئے!)

تاہم 'الہلال' اور 'البلاغ' کی دعوت اتنی بودی اور بے جان نہ تھی کہ اس طرح ختم ہو جاتی۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی ایک دوسری فعّال شخصیت کی صورت میں ظہور کر لیا جس نے اولاً مولانا آزاد مرحوم کے نعرۂ جہاد کو ایک مبسوط تصنیف کا موضوع بنایا اور 'الجہاد فی الاسلام' ایسی معرکۃ الآرا کتاب بالکل نوعمری میں لکھ ڈالی اور پھر ۱۹۳۲ء سے مولانا آزاد کی تفسیر 'ترجمان القرآن' کے ہم نام ماہنامے کے ذریعے قرآن حکیم کی ترجمانی اور خاص طور پر اس کی انقلابی دعوت کے تسلسل کو باقی رکھا۔ یہ ہیں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جنہوں نے ایک طرف 'قیامِ حکومتِ الٰہیہ' کے نصب العین کے پیشِ نظر ۱۹۴۱ء میں 'جماعتِ اسلامی' قائم کی اور دوسری طرف 'تفہیم القرآن' کے ذریعے قرآن مجید کی تعلیمات اور خصوصاً اُس کی انقلابی دعوت کا تعارف برصغیر کے طول و عرض میں بالخصوص جدید تعلیم یافتہ نسل کے ایک بہت بڑے حلقے میں کرا دیا ——— اور اگرچہ

اس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے کہ اپنے پیشرو کی طرح جو ایک وقتی سی رکاوٹ سے بددل ہو کر کانٹا ہی بدل گیا تھا، مولانا مودودی بھی قیامِ پاکستان کے وقت کچھ فوری سی توقعات اور وقتی سے امکانات سے دھوکہ کھا کر پاکستانی سیاست کے گرداب میں کُود پڑے۔ اور پُورے تیس برس ہونے کو آئے کہ وہ پوُری جماعت سمیت اسی صحرائے تیہہ میں سرگرداں ہیں (اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ چالیس سال پُورے کر کے بھی انہیں یا اُن کی جماعت کو اس صحرا نوردی سے نجات ملے گی یا نہیں؟) —— اور اس پر بھی جتنا افسوس کیا جائے کم ہے کہ عمر کے آخری مرحلے میں 'خلافت اور مُلوکیت' نامی تالیف کے ذریعے مولانا مودودی رَفض اور تشیُّع کی تقویت کا موجب بن گئے، تاہم اُن کی خدمات بالکل رائیگاں جانے والی نہیں ہیں۔ انہوں نے بلا مبالغہ لاکھوں انسانوں کے دلوں میں اسلام کے غلبے کی آرزو پیدا کی ہے اور ہزاروں کو اس جدوجہد میں عملاً مبتلا کیا ہے اور اگرچہ ایک غلط فیصلے اور اس پر بیجا اصرار نے اُن کی چالیس سالہ مساعی کو غلط رُخ پر ڈال کر رکھ دیا ہے تاہم قرآن کی انقلابی دعوت کا جو صُور اُنہوں نے پھُونکا ہے وہ یقیناً بہت سے دلوں کو گرماتا رہے گا اور کیا عجب کہ ابو الکلام آزاد مرحوم ثُمَّ ابو الاعلیٰ مودودی کی یہ دعوتِ جہاد پھر کسی گوشے سے نئی آب و تاب اور تازہ جوش و خروش کے ساتھ اُبھرے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ!

(۳) وہ عظیم شخصیت جس سے بّرِ صغیر میں دیوبند اور علی گڑھ کے مابین قرآنی فکر کا تیسرا سوتا پھُوٹا، مولانا حمید الدّین فراہیؒ کی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ قدیم اور جدید کا حسین ترین امتزاج اُن ہی کی ذات میں ہوا۔[۱] انہوں نے بیس سال ہی کی عمر میں اُس دَور کے چوٹی کے علماء سے فارسی، عربی اور دینی عُلوم کی تحصیل مکمل کر لی تھی۔ اس کے بعد وہ علی گڑھ کے ماحول میں رہے اور وہاں انہوں نے انگریزی زبان اور فکرِ جدید کا مطالعہ براہِ راست کیا۔ اور پھر اُن کی نگاہیں قرآنِ حکیم پر مرتکز ہو گئیں۔ اور انہوں نے باقی پوری زندگی 'حکمتِ قرآنی' کی گہرائیوں میں غوطے لگانے

---

[۱] چنانچہ امام فراہیؒ کی وفات پر جو تعزیتی مضمون مولانا سیّد سلیمان ندویؒ نے ماہنامہ معارف شمارہ ۱، ۲ جلد ۲۷ بابت جنوری و فروری ۱۹۳۱ء میں مولانا فراہیؒ ہی کے اس شعر کو عنوان بنا کر لکھا تھا کہ ؎

فغاں کہ گشت نیوشندۂ سخن خاموش   دگر چگونہ تسلّی کنم من ایں لب و گوش

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں بسر کر دی۔ اور اگرچہ اُن کا مزاج "کاتا اور لے دوڑی" کے بالکل برعکس "نیکی کر دریا میں ڈال" والا تھا۔ چنانچہ اپنی زندگی میں مفسّر یا مصنّف و مؤلّف کی حیثیت سے شہرت پانے کی کوئی کوشش انہوں نے نہیں کی بلکہ جو کچھ لکھا اُسے حوالۂ صندوق کرتے چلے گئے۔ تاہم اُن کی جو چند مختصر چیزیں اُن کی زندگی ہی میں شائع ہوئیں، انہوں نے اُن کے "تدبّرِ قرآن" کا لوہا وقت کے چوٹی کے علماء و فضلاء سے منوا لیا۔ اور اُن کی مساعی کا اصل حاصل یہ برآمد ہوا کہ "تدبّرِ قرآن" کا صحیح نہج واضح ہو گیا اور قرآنِ حکیم کے معدنِ علم و حکمت سے معرفت کے ہیرے جواہرات نکالنے کا صحیح طریق معیّن ہو گیا۔

مولانا فراہیؒ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و احسان یہ ہوا کہ انہیں ایسے شاگرد بھی میسّر آ گئے جنہیں اُنہوں نے اپنے طرزِ پر غور و فکر کی تربیت خود دے کر تیار کر دیا تاکہ وہ اُن کے بعد ان کی روشن کی ہوئی راہ پر آگے بڑھ سکیں۔ اُن کے اِن تلامذہ میں سب سے نمایاں مقام تو حاصل ہے مولانا امین احسن اصلاحی کو جنہوں نے نہ صرف یہ کہ حقیقتِ شرک، حقیقتِ توحید، حقیقتِ تقویٰ اور حقیقتِ نماز ایسی گرانمایہ تصانیف کے ذریعے خالص قرآنی علم کلام کی تدوین کی راہ کھول

(گزشتہ سے پیوستہ)

اس کے مندرجہ ذیل ابتدائی الفاظ قابلِ توجہ ہیں: "اس سے پہلے ہندوستان کے جن اکابر علماء کا ماتم کیا گیا ہے، وہ کل وہ تھے جن کی ولادت اور نشو و نما انقلابِ زمانہ سے پہلے ہوئی تھی، آج سب سے پہلی دفعہ ہم نئے عہد کے سب سے پہلے عالم کی وفات کے ماتم میں مصروف ہیں، ہم ایک ایسے گریجویٹ عالم کا ماتم کرتے ہیں جو اپنے علم و فضل، زہد و ورع اور اخلاق و فضائل میں قدیم تہذیب کا نمونہ تھا، لیکن جو اپنی روشن خیالی، جدید علوم و فنون کی اطلاع و واقفیت اور مقتضیاتِ زمانہ کے علم و فہم میں عہدِ حاضر کی سب سے بہتر مثال تھا۔ اس سے پہلے ان تمام علماء نے جو نئے علمِ کلام کا اپنے کو بانی کہتے اور سمجھتے ہیں، جو کچھ کہا اور لکھا، وہ دوسروں سے سنی سنائی باتیں تھیں لیکن اس جماعت میں یہ پہلی ہستی تھی، جس نے فلسفۂ حال کے متعلق نفیاً یا اثباتاً جو کچھ کہا اور لکھا وہ اپنی ذاتی تحقیق اور ذاتی علم و مطالعہ سے آج ہمارے سامنے ایسے متعدد علماء کی مثالیں ہیں جنہوں نے عربی علوم کی تکمیل کے بعد انگریزی شروع کی اور بی۔ اے اور ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی سندیں حاصل کیں، لیکن اس طرح کہ ع

"جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے اُسے صاف دل سے بھلا دیا"

نئے رنگ نے پرانے رنگ کو اتنا پھیکا کر دیا کہ ان پر اس کا نشان بھی نظر نہیں آتا، لیکن آج ہم جس ہستی کا تذکرہ کر رہے ہیں اس کا حال یہ تھا کہ اس نئے رنگ کی شوخی سے اس کے پرانے رنگ کا گہرا پن اور بڑھ گیا تھا اور اس کو دیکھ کر یہ سمجھنا بھی مشکل تھا کہ یہ علی گڑھ کالج اور الٰہ آباد یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ اس کی سادگی کو دیکھ کر عوام بظاہر اس کو عالم بھی مشکل ہی باور کر سکتے تھے مگر وہ وہ تھے جو ابنائے زمانہ میں کوئی نہیں

دی (مولانا کی یہ چاروں تصانیف اب یکجا 'حقیقتِ دین' کے نام سے مطبوعہ موجود ہیں)، بلکہ خواہ عمر کے آخری حصّے میں سہی، اپنے استاذ کے اصول پر باقاعدہ تفسیر 'تدبرِ قرآن' بھی تحریر کر دی (جواب بحمداللہ تکمیل کو پہنچنے ہی والی ہے) اور دوسرے نمبر پر ہیں مولانا صدرالدین اصلاحی جو بھارت ہی میں مقیم ہیں۔

بے لگام اور مادر پدر آزاد متجدّدین اور روایت پرست و قدامت پسند علماء کے بین بین 'فکرِ قرآنی' کے یہ تین دھارے جو برّصغیر پاک و ہند کے محیطِ علمی میں بہہ رہے ہیں بظاہر ایک دوسرے سے بہت مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے لیے جذب و انجذاب کا شدید میلان رکھتے ہیں۔

اِن میں سے مؤخر الذکر دو دھارے تو درحقیقت پھوٹے ہی ایک عظیم اور گھمبیر شخصیت سے ہیں جس نے دیوبند اور علی گڑھ کے مابین ایک درمیانی راہ نکالنے کی غرض ہی سے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ڈیرہ لگایا تھا۔ ہماری مراد علامہ شبلی نعمانی مرحوم سے ہے جنہیں مولانا فراہیؒ اور مولانا آزاد مرحوم دونوں کے مُربّی کی حیثیت حاصل ہے —— ہم نے اب سے لگ بھگ آٹھ سال قبل ایک مفصّل مضمون ان ہی صفحات میں تحریر کیا تھا جس میں علامہ شبلیؒ، مولانا فراہیؒ اور مولانا آزاد مرحوم کے ذاتی میلانات اور علمی و فکری رُجحانات کا جائزہ لیا گیا تھا، جس کی تصویب مولانا عبدالماجد دریابادی نے، جنہیں بلاشبہ اس قافلے کے آخری مسافر کی حیثیت حاصل ہے، ان الفاظ میں کی تھی:-

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حیرت ہوگئی، شبلی، فراہی، ابوالکلام تینوں کی یہ نبّاضی بُعدِ زمانی اور بُعدِ مکانی دونوں کے باوجود اتنی صحیح کیوں کر کر لی! ؎ درحیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید!"

اس تحریر کا حسبِ ذیل اقتباس طوالت کے باوصف، ان شاء اللہ، قارئین پر گراں نہ گذرے گا۔

"مولانا شبلیؒ اپنی ذات میں ایک نہایت جامع الصّفات انسان تھے اور ان کی شخصیت ندوہ کی نسبت بہت زیادہ جامع اور گھمبیر تھی۔ چنانچہ وہ بیک وقت علم و فضل، فلسفہ و کلام، شعر و ادب اور ملّی و قومی سیاست حتّٰی کہ رندی اور رنگینی سب کے جامع تھے۔ اُن کے اصل جانشین

سیّد سلیمان ندوی مرحوم کی شخصیت میں مولانا شبلی کی ہمہ گیر شخصیت کے صرف چند ہی پہلوؤں کا تسلسل قائم رہ سکا۔ لیکن ان کے زیرِ اثر دو اور ہستیاں ایسی پروان چڑھیں جو اُن کی بعض صفات کی وارث بنیں اور جن میں مولانا شبلیؒ کی شخصیت کے بعض دوسرے پہلو اُجاگر ہوئے۔ ہماری مراد مولانا حمید الدّین فراہیؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؔ سے ہے۔ یہ دونوں حضرات براہِ راست تو ندوی نہیں لیکن ان کی تربیت میں مولانا کا بڑا حصّہ ہے ——— اور چونکہ برِّصغیر کی حالیہ مذہبی فکر کے میدان میں علی گڑھ اور دیوبند کی دو انتہاؤں کے مابین دو اہم علمی و فکری سوتے اِن ہستیوں کی بدولت پھوٹے ہیں لہٰذا ان کا کسی قدر تفصیلی تذکرہ ضروری ہے۔ مولانا فراہیؒ اور مولانا آزادؔ مرحوم میں متعدّد اُمور بطورِ قدرِ مشترک بھی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ دونوں کی تربیت میں مولانا شبلی کا حصّہ تھا۔ دوسرے یہ کہ دونوں کو قرآن حکیم سے خاص شغف تھا تیسرے یہ کہ دونوں اپنے وقت کے انتہائی وضع دار انسان تھے۔ چوتھے یہ کہ دونوں (مولانا شبلیؒ کے بالکل برعکس ——— جنہوں نے اپنی 'صنفیّت' کی شدّت کے اظہار کے لیے 'نعمانی' کی نسبت کو اپنے نام کا مستقل جزو بنا لیا تھا) تقلید سے یکساں بعید و بیزار تھے اور دونوں کو اصلی ذہنی و علمی مناسبت امام ابن تیمیہؒ سے تھی لیکن ان اشتراکات کے بعد اختلافات کا ایک وسیع میدان ہے جس میں یہ دونوں شخصیتیں ایک دوسرے کی بالکل ضد تھیں۔ مولانا آزاد میں شبلی کی رندی و رنگینی کا تسلسل بھی موجود رہا جب کہ مولانا فراہیؒ بالکل زاہدِ خشک تھے۔ مولانا آزاد کی وضع داری میں شکوہ و تمکنت کی آمیزش تھی، جبکہ مولانا فراہیؒ پر فقر و درویشی کا رنگ غالب تھا۔ مولانا آزادؔ 'ابوالکلام' تھے اور اُن کی شعلہ بیان خطابت میں ایک لاوا اُگلنے والے زندہ آتش فشاں کا رنگ تھا۔ جبکہ مولانا فراہیؒ نہایت کم گو تھے اور ان کا سکوت ایک ایسے خاموش آتش فشاں سے مشابہت رکھتا تھا جس کے باطن میں تو خیالات و احساسات کا لاوا جوش مارتا ہو لیکن ظاہر میں وہ بالکل ساکت و صامت ہو۔ مولانا آزاد کی تحریر میں اصل زور عربیّت اور عبارت آرائی پر تھا جبکہ مولانا فراہی کی تحریر نہایت سادہ لیکن مدلّل ہوتی تھی۔ مولانا آزاد سیاست کے میدان کے بھی شہسوار تھے اور دین کی وادی میں بھی اُن کا اصل مقام داعی کا تھا جبکہ مولانا فراہی سیاسیّت سے تمام عمر کنارہ کش رہے اور دین و مذہب کے میدان میں بھی ان کا اصل مقام آخر دم تک صرف ایک طالب علم یا زیادہ سے زیادہ ایک مفکّر کا رہا ——— چنانچہ مولانا آزاد طوطیٔ ہند تو تھے ہی، ایک وقت ایسا بھی گزرا جب وہ 'امامُ الہند' قرار پائے جبکہ مولانا فراہی سے اُن کی زندگی میں بھی اور آج تک صرف کچھ علم دوست لوگ ہی واقف ہو سکے ——— لیکن اس کے برعکس مولانا آزاد تو آندھی کی مانند اُٹھے اور بگولے کی طرح رخصت ہو گئے تا آنکہ آج وہ لوگ بھی اُن کا نام لینا تک گوارا نہیں کرتے جنہوں نے اپنی قندیل خود ان ہی کی شمع سے روشن کی جبکہ مولانا فراہی ایک مستقل طرزِ فکر، اور

مکتبِ علمی کی بنیاد رکھ گئے جن کا نام لیوا ایک ادارہ "دائرۂ حمیدیہ" کے نام سے ہندستان میں اور ایک انجمن مولانا امین احسن اصلاحی کی ذات میں پاکستان میں موجود ہے۔
قرآن مجید سے جو شغف ان دونوں بزرگوں کو تھا، مزاج کے افتاد کے فرق کی بنا پر اس کا ظہور بھی مختلف صورتوں میں ہوا۔ مولانا آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ اردو ادب کا تو شاہکار (CLASSIC) ہے ہی، قرآن کے جلال و جمال کا بھی ایک حسین مرقّع ہے۔ پھر سورۂ کہف کے بعض مباحث میں ان کی تحقیق و تدقیق کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔ بایں ہمہ قرآن حکیم کا کوئی مرتّب و منضبط فکر وہ پیش نہیں کر سکے جبکہ مولانا فراہیؒ نے قرآنِ حکیم کے استدلالی پہلو کو واضح کیا اور ایک طرف نظمِ قرآن کی اہمیت واضح کر کے تدبّرِ قرآن کی نئی راہیں کھولیں اور قرآن پر غور و فکر کے اصول و قواعد از سرِ نو مرتّب و مدوّن کیے اور دوسری طرف اپنی بعض تصنیفات میں (جو تا حال مسوّدات ہی کی صورت میں ہیں) خالصتہً قرآنِ حکیم کی روشنی میں ایک نئے علمِ کلام کی بنیاد رکھ دی۔"

قصّہ مختصر ــــــــ علامہ شبلی نعمانیؒ، امام حمید الدّین فراہیؒ اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مابین قربت و یگانگت کا یہی رشتہ تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے معنوی خلیفہ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے "قیامِ حکومتِ الٰہیہ" کے نصب العین کے پیشِ نظر 'جماعتِ اسلامی' کی تاسیس کی تو ان کی دعوت پر نہ صرف یہ کہ مولانا فراہیؒ کے تمام نمایاں شاگرد بشمول مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا اختر احسن اصلاحی، اور مولانا صدر الدّین اصلاحی لبیک کہتے ہوئے حاضر ہو گئے بلکہ مولانا شبلیؒ کے تلمیذ رشید مولانا سیّد سلیمان ندویؒ کے دو ارشد تلامذہ یعنی مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا مسعود عالم ندویؒ بھی ــــــــ "من نیز حاضر می شوم۔۔" کے مصداق بن گئے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اس 'قران السّعدین' سے بہت سی برکتیں ظہور میں آئیں جن کا نمایاں ترین مظہر مولانا امین احسن اصلاحی کی شاہکار تالیف 'دعوتِ دین اور اس کا طریق کار' ہے جس میں ایک جانب مولانا فراہیؒ کے قرآنی غور و فکر کا تعمّق موجود ہے تو دوسری جانب مولانا آزاد مرحوم کا داعیانہ جوش و خروش بھی موجود ہے۔ اور اسی کے ذیل میں آتی ہیں مولانا صدر الدّین اصلاحی کی بعض تصانیف جیسے 'فریضۂ اقامتِ دین' ــــــــ 'حقیقتِ نفاق' ــــــــ اور 'اساسِ دین کی تعمیر' وغیرہ۔

رہا 'فکرِ قرآنی' کا اوّل الذکر دھارا جس میں علاّمہ اقبال مرحوم کو تن تنہا ایک انجمن کی حیثیت حاصل ہے تو اس کا بقیہ دونوں دھاروں سے ربط و تعلق اِس واقعے سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا مودودی کو حیدر آباد دکن کی بنجر اور سنگلاخ زمین سے ہجرت کر کے پنجاب ایسے زرخیز اور سرسبز و شاداب خطّے میں اقامت گزیں ہونے کی دعوت علاّمہ اقبال مرحوم ہی نے دی تھی۔ اور اس سے بھی آگے یہ کہ معروف علماء کے حلقے میں علاّمہ مرحوم کے سب سے بڑے بلکہ غالباً صحیح تر الفاظ میں واحد شیدائی مولانا ابوالحسن علی ندوی ہی ہیں۔

مزید برآں، پنجاب میں مولانا مودودی کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کی دعوت اور جماعت دونوں کو جو فروغ نصیب ہوا بعض دوسرے اسباب و عوامل کے ساتھ ساتھ اس کا اہم ترین سبب یہی ہے کہ یہاں علاّمہ اقبال مرحوم اپنے اشعار کے ذریعے گویا قلوب کی دنیا میں ہل چلا چکے تھے اور اب زمین منتظر تھی کہ کوئی آئے اور بیج ڈالے اور یہ اپنے خزانے اُگل کر رکھ دے۔ خصوصاً پنجاب کا جدید تعلیم یافتہ نوجوان تو گویا اس "دگر دانائے راز" کے لیے چشم براہ تھا جس کا ذکر بشدید حسرت و یاس علاّمہ مرحوم نے مرتے دم کیا تھا!

باب چہارم

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کا

مؤسس

- فکرِ قرآنی کے چار سلسلوں کا قران
- چاروں سلسلوں کی بعض اہم شخصیّتوں سے ذاتی روابط ——— اور
- دو اہم شخصیتوں سے وصل و فصل کی داستان۔

اِن سطور کے ناکارہ و ناچیز راقم کو اپنی اس خوش بختی پر ناز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے نوجوانی ہی کے دَور میں ایسے مواقع پیدا فرما دیئے کہ وہ نہ صرف یہ کہ اپنی بساط کے مطابق فکرِ قرآنی کے متذکرہ بالا تینوں درمیانی دھاروں سے متعارف و مستفید ہوا بلکہ حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حواشی کی وساطت سے اس کا ذہنی رشتہ کم از کم تفسیرِ قرآن کی حد تک ان علماءِ ربّانیین کے حلقے سے بھی قائم ہو گیا۔ جو بلاشبہ "اَلرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ" کہلانے کے مستحق ہیں ——— نتیجۃً بفضل اللہ وعونہٖ اس کی ذات میں بقدرِ وسعتِ ظرف ان انہارِ ثلٰثہ، کے ساتھ ساتھ یہ چوتھا چشمہ صافی بھی رَواں دَواں ہے ——— فلہ الحمد والمنۃ۔

جذباتی سطح پر راقم کی شخصیت پر سب سے پہلی اور سب سے گہری چھاپ علامہ اقبال مرحوم کے اردو کلام کی ہے۔ چنانچہ ہائی اسکول کا پُورا زمانۂ طالب علمی (۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۷ء) احقر نے بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز کے اشعار پڑھتے اور گنگناتے ہوئے بسر کیا۔ جس سے ایک جذبۂ ملّی اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا اور چونکہ اس وقت اس جذبے کے مظہرِ اتم کی حیثیت تحریکِ پاکستان کو حاصل تھی لہٰذا اس دَور میں اپنی بساط کے مطابق عملی وابستگی تحریکِ مسلم لیگ کی تنظیمِ طلبہ یعنی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ساتھ رہی۔ تاہم اسی دَور کے اواخر میں راقم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے بھی متعارف ہو چکا تھا اور "الہلال اور البلاغ" والے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے بھی ——— مولانا مودودی کی تحریروں میں سے یوں تو جو کچھ بھی اس وقت پڑھنے میں آیا بھلا ہی لگا لیکن الحمدللہ کہ ان کے ساتھ راقم کا اصل ذہنی و قلبی رشتہ "تفہیم القرآن" کے ذریعے قائم ہوا جس کے ضمن میں تقسیمِ ہند

شدہ نتائج بالکل زائل ہو جاتے۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہر نیا اندازِ فکر سابق فکر میں ایک ارتقائی شان پیدا کرتا چلا گیا۔ اور یہ عمارت اپنے اطراف و جوانب سمیت بلند ہوتی گئی ——— اس ہمہ جہتی استحکام و ارتقار کے ضمن میں واقعہ یہ ہے راقم سب سے بڑھ کر مرہونِ منّت ہے علامّہ اقبال مرحوم کے فارسی کلام کا جس کے اعتبار سے علامّہ موصوف یقیناً 'رومیٔ ثانی' بھی ہیں اور مجسّم 'ترجمان القرآن' بھی۔ اور اس سلسلے میں شدید ناانصافی ہوگی اگر ذکر نہ کر دیا جائے کہ ابتدائی پانچ سالوں کے دوران راقم کو فائدہ پہنچا مولانا برکات احمد خاں مرحوم (ٹونکی ثمّ ساہیوالی) کی ہم نشینی سے اور بعد کے دس سالوں کے دوران فیض حاصل ہوا پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور کی صحبت سے

الغرض ——— راقم کے فکر و نظر پر ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ کے مصداق ابتدائی اور تکمیلی چھاپ تو ہے علامّہ اقبال مرحوم کی ——— ان میں سے ابتدائی تاثر زیادہ تر جذباتی ہے جس کا حاصل ہے 'جذبۂ ملّی' اور تکمیلی رنگ خالص فکری ہے جس کا موضوع ہے فکرِ جدید کے پس منظر میں قرآنِ حکیم کا مطالعہ یا قرآن حکیم کی روشنی میں فکرِ جدید کا جائزہ و تجزیہ ——— اور ان کے مابین رواں ہیں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کی 'قرآنی دعوتِ جہاد و انقلاب' اور امام حمید الدین فراہیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی کے 'طریقِ تدبّرِ قرآن' اور حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے 'علمِ راسخ' کے کوثر و تسنیم ایسے چشمے ———

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ط

راقم حیران ہے کہ کس منہ سے اور کن الفاظ میں اللہ کا شکر ادا کرے۔ ایک اَن پڑھ یا نیم خواندہ انسان پر جسے اپنی نسبتِ 'امیّت' پر فخر ہے انعامات و اکرامات کی یہ بارش! بقول ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم ع

"اِک بندۂ عاصی کی اور اتنی مداراتیں!"

برّصغیر پاک و ہند کے بیسویں صدی عیسوی کے فکرِ قرآنی کے متذکرہ بالا "سلاسلِ اربعہ" کے اعاظم رجال اور "السابقون الاوّلون" کی اکثریّت کا انتقال تو راقم الحروف کی پیدائش یا شعور کی عُمر کو پہنچنے سے قبل ہو چکا تھا لہٰذا ان کی زیارت سے تو محرُومی ہی رہی۔ البتہ ان کے "مُتّبعینَ باحسان" کی اکثریّت کے ساتھ قریبی تعلّق بلکہ ذاتی و نجی روابط کی سعادت اس عاجز کو حاصل رہی ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کا انتقال راقم کی پیدائش سے لگ بھگ بارہ ۱۲ سال قبل ہو چکا تھا اور ان کے ساتھ راقم کا ذہنی و قلبی رشتہ کُل کا کُل 'غائبانہ' ہے۔ بایں ہمہ ان کی عظمت کے جو نقوش اس عاجز کے قلب پر کندہ ہیں اُن کو الفاظ کا جامہ پہنانا نہایت مشکل نظر آتا ہے۔ مختصر یہ کہ راقم کو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی جامعیّتِ کبریٰ کا عکسِ کامل اُن کی شخصیّت میں نظر آتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ امامُ الہند کی جامعیّت کا مظہر ان کی تصانیف ہیں اور شیخ الہندؒ کی جامعیّت کا ظہور ان کے تلامذہ میں ہوا۔ اگر یہ اُصُول درست ہے اور لازماً درست ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو ذرا پہچاننے کی کوشش کیجئے اس شخص کی عظمت کو جس کا جانشین جہادِ حُرّیّت اور تحریکِ استخلاصِ وطن کے میدان میں ہوا مولانا حسین احمد مدنیؒ ایسا مجاہدِ اعظم۔ اور حدیث، فقہ، اُصُول اور کلام کے میدان میں ہوا مولانا سیّد انور شاہ کاشمیریؒ ایسا نابغہ روزگار انسان۔ اور جس کے فہمِ قرآن اور جذبۂ ملّی کا ظہور ہوا مولانا شبیّر احمد عثمانیؒ ایسی عظیم شخصیّت میں اور جس کے انقلابی کردار نے رُوپ دھارا مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم ایسے سیماب وش انسان کا۔ راقم کا ذاتی احساس یہ ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیّت کو ان کے اپنے حلقے کے لوگوں نے بھی کما حقّہٗ نہیں پہچانا ——— ورنہ ذرا غور کیا جائے تو اس میں کسی شک و شُبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ چودھویں صدی ہجری کے مُجدّد وہ ہیں! ——— واللہ اعلم!

مولانا شبیّر احمد عثمانیؒ کا انتقال تو اگرچہ راقم کے سنِّ شعور کو پہنچنے کے بعد ہوا لیکن افسوس کہ ان کی زیارت سے بھی محرومی ہی رہی۔ تاہم ایک خیال اطمینانِ قلب کا موجب بنتا ہے اور وہ یہ کہ اگر ذرّے کو آفتاب سے کوئی نسبت ہو سکتی ہے تو اس عاجز کو بھی ان کے ساتھ ایک نسبتِ معنوی حاصل ہے۔ بایں طور کہ جب وہ تحریکِ پاکستان کے صفِ اوّل کے قائد کی حیثیّت سے ہندوستان کے طول و عرض کا دورہ کر رہے تھے تو یہ خاکسار بھی خواہ ایک طفلِ مکتب کی

حیثیّت ہی سے سہی مشرقی پنجاب کے ایک ضلع (حصار) کے مختلف قصبات (سرسہ، ہانسی وغیرہ) کے ہائی اسکول کے طلبہ کے مابین ایک رابطہ استوار کرنے کی سعی میں مشغول تھا ـــــ بعدازاں ان کے تفسیری حواشی کی بدولت ان کی جو معنوی صحبت حاصل رہی اس کا ذکر اُوپر ہو ہی چکا ہے۔

مولانا عثمانیؒ کے رفیقِ کار اور معتمدِ خاص مولانا مفتی محمّد شفیعؒ سے ملاقات کا شرف اللہ راقم کو حاصل رہا اور ان کی شفقت و محبّت سے بھی اس عاجز نے حِصّہ پایا۔ مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کے شاگردِ رشید مولانا محمّد یوسف بنّوریؒ کی نیاز مندی کی سعادت بھی راقم کو حاصل رہی اور اُن کی شفقت اور نظرِ کرم بھی اس ناچیز کا سرمایۂ افتخار رہی۔ حضرت شیخ الہندؒ کے فیض کے دوسرے دو چشموں سے بھی راقم بحمداللہ بیگانہ و نابلد نہیں۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے خلیفہ مولانا سیّد حامد میاں مدّظلّہ، اور مولانا سندھی مرحوم کے شاگردِ رشید مولانا احمد علی لاہوریؒ کے خلفُ الرّشید مولانا عبید اللہ انورؒ کی نیازمندی، اور گاہے گاہے اُن کی خدمت میں حاضری کا شرف بھی راقم کو حاصل رہا گویا:

"الرّاسخون فی العلم" کے اس سلسلے کے ساتھ راقم کا معاملہ اس عربی شعر کے مصداق رہا کہ؎

أُحِبُّ الصَّالِحِيْنَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ لَعَلَّ اللهَ يَرْزُقُنِيْ صَلَاحاً

علّامہ اقبال کے انتقال کے وقت بھی راقم کی عمر چھ برس تھی لیکن اب یہ بات خود اس عاجز کو نہایت عجیب اور حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ اُن کے انتقال کو راقم نے ایک ذاتی صدمے کی حیثیّت سے محسوس کیا تھا۔ اس کی ایک ہی توجیہ ممکن ہے اور وہ اس حدیثِ نبویؐ کی روشنی میں کہ اِس عالمِ فانی میں آنے سے قبل عالمِ ارواح میں جن ارواح کے مابین اُنس پیدا ہو جاتا ہے اُن کے مابین مودّت کا رشتہ اِس عالمِ اجساد میں بھی برقرار رہتا ہے ـــــ بہر حال علّامہ مرحوم کے ساتھ راقم کا قلبی تعلّق کم و بیش "مِنَ الْمَهْدِ اِلَی اللَّحْدِ" والا ہے۔ اور اُوپر عرض کیا ہی جا چکا ہے کہ راقم کے شعور کی تحتانی سطحوں میں سے سب سے نچلی تہہ پر نقوش ثبت ہیں علّامہ مرحوم کے اُردو اشعار کے اور اس کے فکر کی بلند ترین سطح پر کندہ ہیں نقوش اُن کے فارسی کلام کے۔

یہی وجہ ہے کہ جب راقم کی ملاقات فلسفۂ اقبال کے مدوّن و شارح' اور حکمتِ اقبال' کے مصنف ڈاکٹر رفیع الدّین مرحوم سے ہوئی تو دونوں ہی نے یہ محسوس کیا کہ وہ ایک دُوسرے سے

بہت پہلے سے واقف ہیں۔ اور جب بھی گفتگو ہوئی یہی محسوس ہوا کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا ‌ ‌ ‌ ‌ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

۱۹۶۷ء سے ۱۹۶۹ء تک تقریباً ڈھائی سال نہایت قریبی تعلّق راقم کو ڈاکٹر صاحب مرحوم سے حاصل رہا۔ (’میثاق‘ کے اس دَور کے فائل اس پر شاہدِ عادل ہیں!) اُس زمانے میں ”اسلام کی نشأۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام“ راقم کے قلم سے نکل کر شائع ہو چکا تھا۔ اس کی حرف بحرف تصویب ڈاکٹر صاحب نے فرمائی اور ’میثاق‘ کے لیے اپنی تصنیف 'MANIFESTO OF ISLAM' کا ترجمہ اُردو میں خود ہی کرنا شروع کر دیا۔ جس کی چند ہی قسطیں چھپنے پائی تھیں کہ ع

”آں قدح بشکست و آں ساقی نماند“

والا معاملہ ہو گیا۔ یغفر اللہ لنا ولہٗ ویدخلہ فی رحمتہٖ۔

اسی طرح کلامِ اقبالؔ کے شارح پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور سے جو ذاتی ربط و تعلق ۱۹۶۶ء میں استوار ہوا تھا وہ بحمد اللہ ان کی وفات تک قائم رہا (یہاں تک کہ بعض واقفینِ حال تو واقعۃً حیرت کا اظہار کرتے رہے کہ پروفیسر صاحب ایسے نازک طبع اور تنک مزاج بزرگ سے راقم کا تعلّق کیسے نبھ رہا ہے) پروفیسر صاحب نے راقم کی تحریر ”نشأۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام“ کی جو مفصّل تائید و تحسین تحریر کی تھی وہ تو بہت سے لوگوں کے علم میں ہے، زبانی جو کچھ فرمایا تھا اسے اس خوف سے نقل نہیں کر سکتا کہ اسے خود ستائی پر محمول کیا جائے گا۔

مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کا انتقال ویسے تو ۱۹۵۸ء میں ہوا۔ لیکن راقم کو جس ابو الکلام سے دلچسپی تھی یا ہے یعنی ’الہلال‘ اور ’البلاغ‘ والا ابو الکلام جس کے بارے میں کمالِ وسعتِ ظرف کا ثبوت دیتے ہوئے فرمایا تھا حضرت شیخ الہندؒ نے کہ ”اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا!“ وہ واقعۃً ۲۱-۱۹۲۲ء کے لگ بھگ ہی وفات پا چکا تھا اور اس کے معنوی خلیفہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے جب اس کے ترک کردہ مشن کی تکمیل کا بیڑا اُٹھایا تو اُسے بجا طور پر اس کی زندگی ہی میں ”مرحوم“ قرار دے دیا تھا ——— تاہم مولانا مرحوم کو دیکھنے کی تمنا راقم کے دل میں مستقل طور پر رہی جسے دو ملکوں کے فاصلے نے بالآخر ۱۹۵۸ء میں حسرت میں تبدیل کر دیا۔

عجیب اتفاق ہے کہ جس سال مولانا مودودی نے مولانا آزاد مرحوم کی تفسیر کے ہم نام ماہنامے 'ترجمان القرآن' کی ادارت سنبھالی وہی راقم کا سنِ پیدائش ہے اور مولانا آزاد کے انتقال کا زمانہ لگ بھگ وہی ہے جب کم و بیش دس سال کی ہم سفری کے بعد راقم کی راہ مولانا مودودی کے راستے سے جُدا ہوئی۔

مولانا مودودی مرحوم و مغفور کے ساتھ راقم کے وصل و فصل کی داستان نہایت طویل ہے۔ مختصر یہ کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک نہایت قریبی تعلق راقم کو مولانا کے ساتھ حاصل رہا۔ ان میں سے ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۳ء تک کے دو سالوں کے دَوران جبکہ راقم اسلامی جمعیتِ طلبہ کے صفِ اوّل کے کارکنوں میں سے تھا، مولانا سے قُرب کا یہ عالم تھا کہ راقم جب چاہتا تھا مولانا کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض مواقع پر فوری مشورے کے لیے راقم الحروف نے مولانا سے نصف شب کے لگ بھگ اُن کی خوابگاہ میں بھی ملاقات کی ۱۹۵۵ء میں راقم جماعتِ اسلامی کا رکن بنا اور بدقسمتی سے اس کے فوراً بعد ہی اس نے شدّت کے ساتھ محسوس کر لیا کہ جماعتِ اسلامی کی تحریک اپنی اصل اساسات سے منحرف ہو چکی ہے۔ اواخر ۱۹۵۶ء میں راقم نے اپنا وہ مفصّل بیان سپردِ قلم کیا جو اب 'تحریکِ جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ' کے نام سے مطبوعہ موجود ہے' فروری ۱۹۵۷ء میں اجتماعِ ماچھی گوٹھ میں راقم نے اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اور حالات کی ستم ظریفی نے اس وقت صورت کچھ ایسی پیدا کر دی کہ گویا مولانا 'لیڈر آف دی ہاؤس' تھے اور یہ خاکسار 'لیڈر آف دی اپوزیشن'! چنانچہ راؤ خورشید علی خان مرحوم نے جو اس زمانے میں جماعتِ اسلامی کی صفِ اوّل کے قائدین میں سے تھے، بھرے اجلاس میں باقاعدہ یہ الفاظ کہے بھی تھے کہ "ڈاکٹر اسرار کو لیڈر آف دی اپوزیشن کی حیثیت حاصل ہے' انہیں اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے پُورا وقت ملنا چاہیئے!" بہرنوع اپریل ۱۹۵۷ء میں راقم نے جماعت کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور اس طرح وہ دس سالہ تعلق ختم ہو گیا ——— اب اس 'فصل' کو بھی بیس ۲۰ برس ہونے کو آئے ہیں' اور اس دَوران میں بھی اُونچ نیچ کے بہت سے ادوار آئے لیکن ان سب کا حاصل یہ ہے کہ ؎

بس اتنا سا تعلق اب اُن سے رہ گیا ہے وہ مجھ کو جانتے ہیں' مَیں اُن کو جانتا ہوں

آج سے تقریباً دس سال قبل جب رحیم یار خاں میں جماعتِ اسلامی سے علیٰحدہ ہونے والے

چند حضرات کے اجتماع میں "ایک نئی اسلامی تنظیم" کے قیام کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ راقم نے بعض معروضات 'میثاق' کے صفحات میں مولانا مودودی کی خدمت میں پیش کی تھیں ـــــ راقم کے احساسات اب بھی بالکل وہی ہیں اور اب جبکہ 'تنظیم اسلامی' کے نام سے ایک چھوٹا سا قافلہ دوبارہ تشکیل پاکر سفر کا آغاز کر چکا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان معروضات کو من وعن دہرا دیا جائے ـــــ وَھُوَ ھٰذَا:

"اس موقع پر بالکل ذاتی حیثیت میں ایک گذارش راقم الحروف جماعت اسلامی کے بزرگوں خصوصاً مولانا مودودی کی خدمت میں کرنا چاہتا ہے۔ گذشتہ ڈیڑھ دو سال کے دوران راقم الحروف کے بعض اقدامات اور اس کی بعض تحریروں سے یقیناً آپ کو شدید تکلیف پہنچی ہوگی۔ لیکن خدا شاہد ہے کہ دل کے کسی بعید ترین گوشے میں بھی ان میں سے کسی اقدام یا تحریر سے آپ کی دل آزاری ہرگز مقصود نہ تھی۔ راقم الحروف کے دل میں اظہارِ دینِ حق اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کا جذبہ آپ ہی کی تحریروں سے پیدا ہوا۔ اسی جذبے سے سرشار ہوکر طالب علمی کے قیمتی اوقات اور عمرِ عزیز کے بہترین لمحات آپ کے بتائے ہوئے طریقے پر جدوجہد کی نذر کیے۔ پھر جب محسوس ہوا کہ آپ غلط رُخ پر چل نکلے ہیں تو ایک بیان کی صورت میں اپنے خیالات کو قلم بند کیا اور آپ سے درخواست کی کہ: "اپنی تو کوئی ایسی خدمت نہیں ہے جس کا واسطہ دے سکوں، آپ ہی کی شفقتیں اور عنایتیں ہیں جن کا واسطہ دے کر آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ میرے اس بیان کو پڑھ ضرور لیں" ـــــ ماچھی گوٹھ کے بھرے اجتماع میں سٹیج پر اعلان کیا کہ: "اگرچہ مجھے اپنے موقف کی صحت کا یقین ہے اور امیرِ جماعت کی طویل تقریر میں مجھے کوئی روشنی نظر نہیں آئی۔ تاہم میں جماعت میں شامل رہوں گا اس لیے کہ اس کے بغیر میں اپنے وجود کا تصور بھی نہیں کر سکتا" لیکن پھر جب کچھ آپ کی 'عنایتوں' میں مزید اضافہ ہوا اور آپ نے اہلِ اختلاف پر ضعفِ ارادہ بسیط اور ضعفِ ارادہ مرکب کی پھبتیاں چست کرنی شروع کیں اور کچھ یہ محسوس ہوا کہ جماعت میں عضوِ معطل کی حیثیت سے رہنا آخر چہ سود؟ تو یہ کہتے ہوئے ایک بھاری دل کے ساتھ جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی کہ: "میں جانتا ہوں کہ جماعت کے بہت سے بزرگ مجھ سے بزرگانہ شفقت کا اور کتنے ہی ارکان و متفق مجھ سے حقیقی محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔ جب میں سوچتا ہوں کہ آج اپنے اس اقدام سے میں نہ معلوم کتنوں کے جذبات مجروح کروں گا تو اپنے ہی آپ میں ایک ندامت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود اس اقدام پر مجبوراً اس لیے آمادہ ہو گیا کہ اب اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا۔" علیحدہ ہونے کے بعد بھی کم وبیش پانچ سال تک شدید اختلاف کے باوجود آپ کے ساتھ وہی قلبی تعلق قائم رہا جو ایک احسان مند کا اپنے محسن سے ہوتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۲ء میں حج کے لیے روانہ ہونے سے قبل آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی اس قلبی کیفیت کا اظہار بھی کیا تھا۔ افسوس کہ اس کے فوراً بعد آپ کے دو اقدامات یعنی ایک خلافِ کعبہ کے سوانگ اور دوسرے سہروردی مرحوم سے ربط وتعلق کی بدولت دل کی یہ کیفیت برقرار نہ رہ سکی اور ذہنی دوری کے ساتھ ساتھ ایک ایسا قلبی بُعد بھی قائم ہو گیا جس میں رنج کے ساتھ غصّے کی بھی آمیزش تھی۔ اب

"خلافت وملوکیت" لکھ کر عمر کے آخری حصّے میں جو کمائی آپ نے کی ہے اُس کی وجہ سے غصّے کی جگہ حسرت نے لے لی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب آپ کے بارے میں سوچتے ہوئے دِل کانپنے لگتا ہے اور دل کی گہرائیوں سے یہ دعا نکلنے لگتی ہے کہ: ـــــــ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ بایں ہمہ اب جب کہ ہم آپ کے کچھ قدیم ساتھی، رفیق اور نیاز مندوں کی چھوٹی بڑی خدمت کے ارادے سے جمع ہو رہے ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنے خیال کے مطابق ہم آپ ہی کے ترک کردہ مشن کے لیے اُٹھ رہے ہیں۔ اس شیرازہ بندی سے مقصود ہرگز آپ کی مخالفت نہیں ہے۔ اگرچہ فرمانِ نبوی صلّی اللہ علیہ وسلّم کہ "اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ" کی رُو سے آپ کی جن باتوں کو ہم غلط سمجھتے ہیں اُن پر لامحالہ تنقید کرنی ہوگی تاہم اس سے مقصود سوائے اصلاح کے اور کچھ نہ ہوگا۔

مولانا حمید الدّین فراہیؒ کا انتقال بھی راقم کی پیدائش سے تقریباً ڈیڑھ سال قبل ہو گیا تھا۔ اور غالباً ۱۹۵۳ء ۱۹۵۴ء تک راقم مولانا کے نام تک سے واقف نہ تھا۔ بعد میں جب مولانا امین احسن اصلاحی کی وساطت سے ان سے تعارف ہوا اور ان کی تحریریں بھی دیکھنے میں آئیں اور اُن کے حالاتِ زندگی بھی معلوم ہوئے تو اندازہ ہوا کہ واقعۃً ایک نہایت عظیم ہستی تھی جو نہایت خاموشی کے ساتھ قرآن حکیم پر غور و فکر اور تدبّر و تفکّر کی ایک بالکل نئی طرح ڈال کر رخصت ہو گئی۔ اُن کی شخصیت کا جو ہیولیٰ راقم الحروف کے تصوّر میں اُبھرتا ہے وہ سقراط سے بہت مشابہ ہے۔ ایک حکیم و دانا اور نیک و پارسا انسان جو لوگوں کی تعریف و تحسین اور تنقید و ملامت دونوں سے یکساں بے نیاز ہو اور یا تو خاموش تعقّل و تفکّر میں غرق ہو یا اپنے چند شاگردوں کو نہایت دھیمے طریق پر اور مکالمے کے سے انداز میں اس طرح درس دے رہا ہو جیسے کوئی بزرگ کسی بچّے کی اُنگلی پکڑ کر اسے چلنا سکھاتا ہے اور راقم اسے اپنی بہت بڑی خوش قسمتی سمجھتا ہے کہ اسے حکیم فراہیؒ کا نہ سہی اُن کے شاگردِ رشید کا قرب تقریباً رُبع صدی تک حاصل رہا۔

مولانا امین احسن اصلاحی کے ساتھ تعلّق کا آغاز تو مولانا مودودی کی طرح ۱۹۴۷ء ہی میں ہو گیا تھا۔ (بلکہ راقم نے مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی دونوں کو پہلی بار ۱۹۴۶ء میں دارالاسلام پٹھانکوٹ میں دیکھا تھا جہاں وہ اپنے بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کی معیّت میں حاضر ہوا تھا) لیکن ۱۹۵۱ء تک یہ تعلّق کُلّیۃً یک طرفہ تھا یعنی صرف ان کی تقریریں اور درس سُن لینے تک محدود تھا۔ تاآنکہ نومبر

۱۹۵۱ء کی ایک شام کو وائی، ایم، سی، اے ہال لاہور میں راقم نے اسلامی جمعیّت طلبہ پاکستان کے تیسرے سالانہ اجتماع کے موقعہ پر مولانا کے زیرِ صدارت اپنی وہ پہلی عوامی تقریر کی جو اب تک جمعیّت کے دعوتی لٹریچر کا اہم جزو ہے اور "ہماری دعوت اور ہمارا طریقِ کار" کے عنوان سے طبع ہوتی ہے۔ راقم کی اس تقریر کی تعریف و تحسین مولانا نے دل کھول کر فرمائی ——— اور یہیں سے وہ 'یک طرفہ تعلّق' باقاعدہ 'دوطرفہ تعلّقات' میں تبدیل ہوگیا ——— دسمبر ۱۹۵۱ء اور جولائی ۱۹۵۲ء میں جمعیّت طلبا کی دو تربیّت گاہوں میں راقم ناظم کی حیثیّت سے شریک رہا اور مولانا معلّم و مربّی کی حیثیّت سے اس سے ان تعلّقات کی گہرائی و گیرائی میں نمایاں اضافہ ہوا ——— بعد کے چار سالوں کے دوران بے تکلّف ملاقاتوں سے یہ تعلّق مزید اُستوار ہوا ——— ۱۹۵۶ء میں جماعتِ اسلامی کی مرکزی مجلسِ شوریٰ کے اجلاس میں مولانا نے راقم کے متذکرہ بالا اختلافی بیان کی نہایت شاندار الفاظ میں تصویب و تائید کی۔ اس طرح جماعت میں پالیسی کے بارے میں جو اختلافِ رائے ہوا اس کے ضمن میں بھی ع "ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز" کے مصداق مولانا اور راقم ایک ہی صف میں شامل ہوگئے ——— ۱۹۵۸ء میں جب مولانا نے بھی جماعت کو خیرباد کہہ دیا اور کسی نئی تعمیر کی فکر میں 'مشاورتوں'[1] کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا تو اس میں بھی مسلسل ساتھ رہا۔ اور اس سلسلے کا اہم ترین اجتماع عزیز ٹینیریز ہڑپہ میں راقم ہی کے زیرِ اہتمام غالباً چار روز تک جاری رہا لیکن افسوس کہ کوئی متفق علیہ نقشہ نہ بن سکا۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں راقم ان مشاورتوں کی مسلسل ناکامی سے بددل سا ہو کر ڈاکٹر مسعود الدّین حسن عثمانی کی دعوت پر بغیر مولانا کو اطلاع دیئے کراچی منتقل ہوگیا تو ایک حد درجہ محبّت بھرا شکوہ مولانا نے اپنے ایک مکتوب میں کیا:

---

[1] ان 'مشاورتوں' پر ایک نہایت دلچسپ پھبتی اس زمانے میں ملک نصر اللہ خان عزیز مرحوم نے چست کی تھی۔ ہوا یوں کہ ملک صاحب علیل تھے، راقم اور مولانا حکیم عبدالرّحیم اشرف ان کی عیادت کے لیے ان کے پارک لین، مَیل روڈ والے مکان میں حاضر ہوئے تو باتوں باتوں میں ان 'مشاورتوں' کا ذکر بھی آگیا۔ اس پر ملک صاحب نے یہ لطیفہ سنایا کہ ایک بہت بڑے پیر صاحب نے اپنے خلفاً مجاز کی ایک مشاورت طلب فرمائی، اور مشورہ طلب بات یہ پیش کی کہ ع "عمر لیست کہ آوازۂ منصور کہن شد!" آپ لوگوں کا کیا خیال ہے کیا ہم اس کا اعادہ نہ کر دیں؟ ——— سب لوگوں نے اپنی اپنی رائے پیش کی، کسی نے اثبات میں کسی نے نفی میں، ایک صاحب خاموش رہے۔ حضرت نے ان سے براہِ راست استفسار کیا تو انہوں نے مؤدّبانہ گذارش کی کہ "حضرت میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا منصور نے بھی وہ اقدام کسی سے مشورہ لے کر کیا تھا!"

"آپ کے اس خفیہ اقدام کی اطلاع سیال صاحب سے مجھے ہو چکی تھی۔ بہر حال جو کچھ آپ نے کیا اچھا کیا۔ خدا کرے آپ کے مقاصد وہاں پورے ہوں اور آپ کو وہاں دلجمعی کے ساتھ کچھ لکھنے پڑھنے کی فرصت ملے۔ ڈاکٹر صاحب کی رفاقت ان شاء اللہ آپ کے لیے موجب خیر و برکت ہوگی فرزانوں کے ساتھ نباہ مشکل ہوتا ہے دیوانے گذارے جاتے ہیں۔ آپ دونوں دیوانے ہیں۔ خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ مجھے جو احساس ہے وہ صرف یہ ہے کہ آپ مجھ سے دور ہو گئے آپ سے ایک قلبی لگاؤ سا ہو گیا ہے۔ اس وجہ سے اس بات سے تھوڑی سی تکلیف ہے کہ میں نے جتنا ہی کھینچنا چاہا اتنے ہی آپ کھنچتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ کھنچتے کھنچتے کراچی پہنچ گئے۔ خیر صاحب جہاں رہو سلامت رہو اور دعاؤں میں ہمیں بھی یاد رکھو۔۔۔!"

۱۹۵۹ء میں اس خیال سے کہ محض ایک سابقہ تعلق کی بنیاد پر نئی تعمیر ممکن نہیں ——— اس کی فکری اساسات کو تفصیل کے ساتھ واضح کیا جانا چاہیئے۔ مولانا نے ماہنامہ 'میثاق' جاری فرمایا تو راقم اس کے اوّلین معاونین میں بھی شامل تھا اور بعد میں بھی مقدور بھر اعانت کرتا رہا اور دوسری طرف کراچی سے والد صاحب مرحوم کی علالت کے باعث واپسی پر ۱۹۶۰ء میں راقم نے منٹگمری (حال ساہیوال) میں ایک اسلامی ہاسٹل قائم کیا اور حلقۂ مطالعۂ قرآن کی داغ بیل ڈالی تو مولانا نے راقم کے ان کاموں میں بھر پور تعاون فرمایا۔ ہاسٹل کی تجویز پر ایک مفصّل تائیدی شذرہ 'میثاق' میں تحریر فرمایا اور حلقۂ مطالعۂ قرآن منٹگمری کی دعوت پر تقریر کے لیے دو بار ساہیوال کے سفر کی زحمت برداشت کی!

۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک تقریباً چار سال راقم نے دوبارہ ایک دوسرے سلسلے میں کراچی میں بسر کیے۔ اور اس عرصے میں راقم کا رابطہ مولانا سے بہت کم رہا۔ مولانا نے اس دوران میں بعض دوسرے احباب کے ساتھ مل کر 'مجلس دعوت و اصلاح' کی داغ بیل ڈالی لیکن نہ تو یہ بیل ہی منڈھے چڑھی نہ ہی اجتماعی کام کا کوئی اور نقشہ تیار ہو سکا۔ اس سے بد دل ہو کر مولانا نے ذاتی طور پر 'حلقۂ تدبر قرآن' قائم فرمایا اور اپنی ساری توجہات چند نوجوانوں کی تعلیم و تربیت پر مرکوز کر دیں۔ دوسرے احباب سے ان دنوں مولانا کا رابطہ کمزور پڑتے پڑتے معدوم کے حکم میں آگیا۔ جس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ 'میثاق' نے پہلے تو کچھ عرصے تک ہچکیاں لیں اور بالآخر بالکل دم توڑ دیا ——— یہ حالات تھے جب راقم ۱۹۶۶ء میں دوبارہ وارد لاہور ہوا 'میثاق' بند پڑا تھا، تفسیر کی جلد اوّل تیار تھی لیکن اس کی طباعت و اشاعت کی کوئی سبیل دُور دُور تک نظر نہ آتی تھی 'حلقۂ تدبر قرآن' میں جن نوجوانوں پر مولانا نے شدید محنت کی تھی وہ سب بسلسلۂ روزگار تتر بتر ہو گئے تھے۔ ایک صاحب کسی ٹریننگ کے سلسلے میں انگلستان جا

چکے تھے دوسرے صاحب کا تبادلہ ڈھاکہ ہوگیا۔ بعض دوسرے لوگ بددل ہوگئے تھے۔ الغرض بالکل ع

"دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا"

والا سماں تھا ———— خود راقم کے سامنے لاہور نقلِ مکانی میں دو مقصد تھے: ایک 'حلقۂ تدبرِ قرآن' میں شرکت اور مولانا کے سامنے باضابطہ زانوئے تلمذ تہ کر کے ان سے استفادہ اور دوسرے اس اصل تحریکِ اسلامی کے احیاء کی سعی جو راقم کے خیال کے مطابق جماعتِ اسلامی کے انتقالِ توقف کے باعث مردہ ہو چکی تھی ———— لاہور آ کر اندازہ ہوا کہ مولانا 'حلقۂ تدبرِ قرآن' سے بھی بددل ہو چکے ہیں اور اس نہج پر از سرِ نو محنت کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتے ———— اور اب سارا وقت اور ساری محنت تفسیر کی تسوید پر صرف کر دینا چاہتے ہیں۔ لہٰذا راقم کا پہلا مقصد تو فوت ہو گیا لیکن ہمت کر کے 'تدبرِ قرآن' کی جلد اوّل اس نے شائع کر دی اور مولانا نے از راہِ شفقت اس زمانے میں برملا نہ صرف راقم سے کہا بلکہ دوسرے بہت سے احباب و رفقاء کے سامنے فرمایا "کہ اس کا مجھ پر ذاتی احسان ہے"۔ راقم کے سامنے اصل مسئلہ یہ تھا کہ اگر جلد اوّل شائع نہ ہوئی تو آگے لکھنے پر مولانا کی طبیعت مائل نہیں ہوگی اور یہ کام ادھورا رہ جائے گا ————

دوسرے مقصد کے ضمن میں راقم نے اوّلاً مولوی محی الدّین سلفی مرحوم کی تحریک پر اور ان کے تعاون سے اپنا اختلافی بیان "تحریکِ جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" کے نام سے شائع کیا۔ اور بعد ازاں ایک باضابطہ دعوت کے آغاز کے لیے 'الرّسالہ' کے نام سے ایک ماہنامے کا ڈیکلریشن حاصل کر لیا۔ مولانا کو جب اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے فرمایا کہ کوئی نیا رسالہ جاری کرنے کی بجائے 'میثاق' ہی کو سنبھال لو، مَیں تو اسے جاری نہیں رکھ سکتا۔ تم شائع کرتے رہو گے تو کم از کم اس کا نام تو رہے گا۔ 'اِمۡتِثَالاً لِلۡاَمۡرِ' راقم نے بہت دوڑ دھوپ سے حاصل کیا ہوا ڈیکلریشن ضائع کر دیا اور اگست ۱۹۶۶ء سے "زیر سرپرستی مولانا امین احسن اصلاحی" میثاق کی ادارت سنبھال لی۔

۱۹۶۶ء، ۱۹۶۷ء کے دوران 'میثاق' کے ذریعے راقم نے ایک طرف تو یہ واضح کیا کہ ۱۹۵۶ء ۱۹۵۷ء میں جماعتِ اسلامی میں جو اختلاف رائے واقع ہوا تھا اس کی اصل نوعیت کیا تھی اور علیحدہ ہونے والے علیحدگی اختیار کرنے پر کس طرح مجبور کر دیئے گئے تھے ———— اور دوسری طرف علیحدہ ہونے والوں کو للکارا کہ اگر وہ جماعتِ اسلامی میں کسی شخصی عقیدت کی بنا پر نہیں بلکہ 'فریضۂ

اقامتِ دین کی ادائیگی کے لیے شامل ہوئے تھے تو جماعت سے علیٰحدگی سے وہ فرض تو ساقط نہیں ہوگیا۔ ان کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے دینی فرائض کی ادائیگی کے لیے مجتمع ہو کر جدّ و جہد کریں۔ اس کا بحمد اللہ خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور اواخر ۱۹۶۷ء میں جماعتِ اسلامی سے علیٰحدہ ہونے والے بعض احباب کا ایک اجتماع رحیم یار خاں میں منعقد ہوا جس میں "ایک نئی دینی تنظیم" کے قیام کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اس اجتماع میں مولانا بھی شریک تھے اور انہوں نے اس موقع پر بھی حسبِ عادت نہایت فراخدلی سے ان لوگوں کو خراجِ تحسین اور ہدیۂ تشکر پیش کیا تھا جنہوں نے انہیں بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔ ان کے مندرجہ ذیل الفاظ راقم نے ستمبر اکتوبر ۱۹۶۷ء کے 'میثاق' کے کور پر نمایاں حیثیت سے شائع کیے تھے:

"عزیز ساتھیو!
اللہ تعالیٰ کی توفیق سے آپ نے ایک جماعتی نظم کے قیام کی قرارداد پر اتفاق کر لیا۔ میں اس پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کام کے لیے عزم و ہمت عطا فرمائے اور ہر قدم پر ہماری دست گیری اور رہنمائی فرمائے۔ میں اس موقع پر آپ کے سامنے یہ اعتراف کرتا ہوں کہ ہر چند اس کی ضرورت' اور اہمیّت مجھ پر واضح تھی لیکن میں دو سبب سے اس قسم کی کسی ذمہ داری سے گریز کرتا رہا۔ ایک تو یہ کہ اب میرے قویٰ ضعیف ہو رہے ہیں کوئی بھاری بوجھ اٹھانا میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ دوسرا یہ کہ زندگی کے آخری دَور کے لیے اپنے ذوق کے مناسب جو کام میں نے تجویز کر لیا تھا اب وقت و فرصت کا لمحہ لمحہ اسی پر صرف کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ دوستوں کے شدید اصرار بلکہ دباؤ کے باوجود میں خود اس کے لیے پہل کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ دوستوں نے جب کبھی اس فریضہ کی اہمیّت کی طرف توجہ دلائی، میں ان کے دلائل کا تو انکار نہ کر سکا لیکن اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں پر نگاہ کر کے ان کی بات کو ٹالتا ہی رہا۔ میں یہ بھی محسوس کرتا رہا کہ اگرچہ میرے اوقات تمام تر دینی و علمی کاموں ہی میں بسر ہو رہے ہیں تاہم معاشرے سے متعلق مجھ پر جو فریضہ عائد ہوتا ہے اس میں مجھ سے کوتاہی ہو رہی ہے جس کے سبب سے نہ صرف میری بعض صلاحیتیں سکڑ رہی ہیں بلکہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ اس پر مجھ سے مواخذہ ہو۔ ان تمام احساسات کے باوجود میں اپنے آپ کو معذور سمجھتا رہا جس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو معذور سمجھنے میں بڑا فیاض ہوتا ہے۔
بہر حال اب میں پورے شرحِ صدر کے ساتھ اس کام میں شریک ہوتا ہوں اور ان تمام دوستوں کا دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے اس عظیم فرض کی اہمیت کو سمجھا اور ہم سب کو اس کے سمجھانے کا اہتمام کیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی طرف سے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔" امین احسن اصلاحی۔

لیکن افسوس کہ سابقہ تمام مساعی کی طرح یہ کوشش بھی بالکل ع "اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار

ہم ہوئے" کے سے انداز میں ناکام ہو کر رہ گئی۔

یہ دَور راقم کی زندگی میں ایک اہم موڑ (TURNING POINT) کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے کہ اس وقت راقم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب کسی 'بڑے' کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا ہے۔ اور کوئی چلے نہ چلے اور ساتھ دے نہ دے تن تنہا چلنا پڑا تب بھی سفر کا آغاز بہر حال کرنا ہے۔ گویا ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۷ء دس سال مولانا مودودی کے ساتھ اور ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۸ء دس سال مولانا اصلاحی کے ساتھ راقم کلّیۃً و کاملۃً وابستہ رہا۔ لیکن ۱۹۶۸ء سے (لگ بھگ چھبّیس برس کی عمر میں) اس نے آزادی کے ساتھ اپنی ڈگر پر چلنے کا فیصلہ کر لیا۔ تاہم بحمداللہ، راقم اپنے ماضی سے منقطع نہیں ہوا اور اس نے ایک جانب حلقہ ہائے مطالعہ قرآن پر اپنی تمام تر مساعی صرف کر دیں اور ان کے ذریعے اصلاً قرآن کی اس انقلابی دعوت کا پرچار کیا جس کے برصغیر میں موجودہ صدی کے داعیٔ اوّل تھے مولانا ابوالکلام آزاد اور جس کے تسلسل کو برقرار رکھا تھا مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اور دوسری جانب 'دارالاشاعت الاسلامیہ' کے ذریعے اپنے جملہ وسائل و ذرائع کو کھپا دیا مولانا فراہیؒ اور مولانا اصلاحی کی تصانیف کی اشاعت کے ذریعے تدبّر قرآن کے اس اسلوب کی ترویج و اشاعت میں جس کے بانی ہیں مولانا حمیدالدین فراہیؒ اور شارح ہیں مولانا امین احسن اصلاحی ——— لیکن اب چونکہ راقم کسی ایک لیکر کا فقیر نہیں رہا تھا لہٰذا اس کی 'سوچ' کے دوسرے اجزائے ترکیبی بھی سامنے آنے لگے۔ اور ۱۹۶۸ء سے 'میثاق' میں 'افاداتِ فراہیؒ' اور 'تدبّر قرآن' کے ساتھ ساتھ نہ صرف مولانا سندھی مرحوم کے تذکرے اور ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کے 'منشورِ اسلام' بلکہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے "ربّانیہ لا رھبانیہ" اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے "حقیقتِ تصوّف" اور "تاریخ تصوّفِ اسلامی" ایسے مضامین کو بھی جگہ ملنے لگی۔ اور یہی مولانا اصلاحی کی راقم الحروف کی جانب سے گرانیٔ طبع کا سببِ اوّل بن گئی۔ اس لیے کہ مولانا برملا فرمایا کرتے ہیں کہ "میں تصوّف کو کُل کا کُل ضلالت و گمراہی سمجھتا ہوں"۔ چنانچہ مولانا نے راقم سے مشفقانہ انداز میں فرمانا شروع کیا کہ "عزیزم! تمہارے بارے میں مجھے دو اندیشے لاحق ہیں۔ ایک یہ کہ تم انتہائی ذہین ہو اور دوسرے یہ کہ تمہارے اندر تصوّف کی لٹک موجود ہے"۔ راقم اسے ہنس کر ٹال دیتا رہا اور مولانا کی مروّت و شرافت کہ وہ تعلّقات کو (اپنے بعض شاگردوں اور احباب کی شدید سرگرانی کے علی الرّغم) نباہتے رہے!

۱۹۷۱ء کے دوران اُدھر تو مولانا علیل ہو گئے اور ان کی علالت تشویشناک صورت اختیار کر گئی اور اِدھر راقم کے حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن وسعت اختیار کر گئے اور اُس کے اعوان و انصار کا ایک خاصا بڑا حلقہ وجود میں آگیا اور بالکل فطری طور پر کسی باقاعدہ ادارے کے قیام کی ضرورت محسوس ہوئی جس کے تحت کم از کم مالی اُمور منضبط کیے جا سکیں۔ یہی ضرورت تھی جس کے تحت 'مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' کے قیام کا فیصلہ ہوا۔ راقم اس سے بہت پہلے گہرے غور و خوض کے بعد اس حتمی نتیجے تک پہنچ چکا تھا کہ کسی دینی تنظیم میں شورائیت اُس جمہوری طرز کی نہیں ہونی چاہیے جس میں بقول علامہ اقبال مرحوم ع "بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے" بلکہ اُس طرز کی ہونی چاہیے جو اسلام کے نظام امارت کے ساتھ مناسبت رکھتی ہو جس میں امیر صرف دستوری صدر نہیں بلکہ صاحبِ امر ہوتا ہے۔ چنانچہ بلا خوفِ لومۃ لائم راقم نے اپنے اس خیال کو تحریر و تقریر دونوں صورتوں میں بیان بھی کیا اور انجمن کا مجوّزہ دستوری خاکہ بھی اسی نہج پر تیار کیا۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ جیسے ہی ڈھانچہ 'میثاق' میں شائع ہوا، مولانا بھی بفضلہٖ تعالیٰ صحت یاب ہو گئے۔ اب جو اُن کے علم میں یہ خاکہ آیا تو وہ سخت برہم ہوئے اس لیے کہ اس معاملے میں بھی راقم کی اور ان کی رائے کے مابین بُعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ نتیجۃً وہ دوطرفہ تعلقات جو بیس سال سے نہایت خوشگوار چلے آ رہے تھے ایک شدید بحران (CRISIS) سے دوچار ہو گئے۔ بعض احباب نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی لیکن راقم نے صاف عرض کر دیا کہ اُس کی بھی یہ سوچی سمجھی رائے ہے اور اب اس میں تبدیلی صرف اس طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ اسے دلیل سے قائل کر دیا جائے۔ محض پاسِ ادب اور لحاظِ بزرگی کی بنا پر وہ اپنی رائے تبدیل نہیں کرے گا۔ چنانچہ "ھذا فراق بینی وبینک" کا آغاز ہو گیا اور اس کے پہلے قدم کے طور پر طے پایا کہ 'میثاق' کے سرورق پر سے "زیرِ سرپرستی مولانا امین احسن اصلاحی" کے الفاظ حذف کر دیئے جائیں۔ تاہم یہ مولانا کی عالی ظرفی ہے کہ اس کے بعد بھی نہ صرف یہ کہ ذاتی تعلقات برقرار رہے بلکہ جزوی تعاون بھی جاری رہا۔

مارچ ۱۹۷۴ء سے انجمن خدام القرآن کی سالانہ قرآن کانفرنسوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور اس میں راقم نے تقریباً تمام مکاتبِ فکر کے علماء کو صدارت یا خطاب کے لیے دعوت دی جسے ان کی اکثریت نے ازراہِ شفقت و عنایت منظور فرما لیا۔ یہ چیز راقم کے اور مولانا کے مابین مزید بُعد و فصل کا سبب بن گئی

ان کا فرمانا یہ تھا کہ "ان مولویوں کو سر پر بٹھا کر کیا لینا ہے؟ ان ہی کے خیالات و تصورات کی تو ہمیں تردید کرنی ہے!" راقم نے اسے بھی خاموشی سے سنا ان سنا کر دیا اس لیے کہ اُس کی طبیعت کا رُخ جیسا کہ اُوپر تفصیل سے بیان ہو چکا، بالکل دُوسرا ہے۔ تاہم اُس نے محسُوس کر لیا کہ اب مولانا کے مزاج میں تلخی بڑھتی جا رہی ہے۔

جولائی ۷۴ء میں راقم نے اعلان کیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ یہ چھوٹی سی تحریکِ اسلامی جس کا آغاز 'دعوتِ رجوع الی القرآن' سے ہوا تھا اور جس نے پہلی تنظیمی ہیئت 'انجمن خدام القرآن' کی صورت میں اختیار کی تھی اگلے تنظیمی مرحلے میں قدم رکھے اور ٹھیٹھ دینی اصُولوں پر جماعت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ جس کا ہیولیٰ راقم کے پیشِ نظر وہی تھا جو ۶۷ء میں اجتماع رحیم یار خاں میں طے پایا تھا۔ چنانچہ 'میثاق' کی ستمبر، اکتوبر اور نومبر ۷۴ء کی اشاعتوں میں راقم نے اپنی جولائی ۷۴ء والی تقریر اور تنظیم اسلامی کا ۶۷ء والا خاکہ ایک طویل اداریے سمیت شائع کر دیا۔

اس موقع پر راقم مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو مولانا نے جو کچھ فرمایا اس کا حاصل یہ ہے کہ ——— 'پرچہ کل ہی ملا تھا، میں نے رات ہی پُورا پڑھ ڈالا۔ اور رات کے دو بجے تک لالٹین کی روشنی میں اسے پڑھتا رہا۔ تم نے خلا کی نشاندہی بالکل صحیح کر دی ہے۔ اور کرنے کا کام بھی ٹھیک متعیّن کر دیا ہے البتہ تم نے بہت بھاری بوجھ اٹھا لیا ہے اور ایک بڑی ذمّہ داری اپنے سر لے لی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے اندر اس کی ہمّت نہ تھی۔ لیکن اب جبکہ تم نے یہ بوجھ اُٹھا ہی لیا ہے تو مَیں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ تم اس میں ناکام ہو بلکہ دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں کامیاب کرے ——— اس لیے کہ میں ہرگز ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اگر خود کوئی کام نہیں کر سکتے تو کسی دوسرے کو کرتا بھی نہیں دیکھ سکتے۔ ۔ ۔ ۔'

مولانا کا یہی وہ حوصلہ افزا طرزِ عمل تھا جس سے راقم کو جرأت ہوئی کہ مارچ ۷۵ء میں جب تنظیم اسلامی کا باضابطہ قیام عمل میں آیا۔ اور اس کا دستور طے پایا تو اس میں ایک 'حلقۂ مشاورین' بھی رکھا گیا۔ جس کی زبانی اطلاع پر تو مولانا نے شیخ جمیل الرّحمان صاحب اور کراچی کے بعض دوسرے رفقاء سے یہ فرمایا کہ "آپ لوگوں نے یہ بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے یہ خدمت میں بخوشی سرانجام دونگا" لیکن جب باقاعدہ تحریری صُورت میں وہ خاکہ اُن کے سامنے آیا تو انہوں نے اس میں شمولیت سے

انکار فرما دیا۔

اس کے بعد بھی لگ بھگ ایک سال تک مولانا کی خدمت میں راقم کی حاضری کا سلسلہ جاری رہا۔ جنوری ۷۶ء میں 'قرآن اکیڈمی' کی تعمیر کے آغاز کا مرحلہ آیا اور ساتھیوں نے اس موقع پر ایک اجتماعی دعا کا پروگرام بنایا تو اُس میں شرکت کی دعوت راقم نے مولانا کو بھی دی۔ جسے انہوں نے کمال شفقت و مروّت سے منظور فرما لیا۔ اور وہ اپنے خویش کلاں نعمان علی صاحب کی معیت میں تشریف لائے۔ لیکن بعد میں بعض حضرات سے سننے میں آیا کہ مولانا نے فرمایا کہ "میری طبیعت بالکل آمادہ نہ تھی لیکن جب اُس نے کہا تو میں انکار نہ کر سکا اور مجبوراً شریک ہو گیا"۔ راقم کی اصل مشکل یہ تھی کہ مولانا سے ملنا جلنا بھی ہو اور پھر انہیں اپنے کاموں میں شرکت کی دعوت نہ دی جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ رہے سہے تعلّق کو خود راقم نے ختم کر دیا۔

اسی پس منظر میں راقم نے مارچ ۷۶ء میں تیسری سالانہ قرآن کانفرنس میں شرکت کی دعوت مولانا کو دی اور حسبِ سابق اسے بھی مولانا نے منظور فرما لیا لیکن بعد میں اپنے بعض دوستوں اور شاگردوں کے اِصرار پر شرکت سے انکار کر دیا ——— یہ گویا ان دو طرفہ تعلّقات کے ضمن میں اونٹ کی کمر پر آخری تنکا ثابت ہوا اور راقم نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ مولانا کی خدمت میں حاضری کا سلسلہ بھی بند کر دیا جائے تاکہ وہ بار بار اس طرح کی پریشان کن صورتِ حال سے دوچار نہ ہوں۔ اور اس طرح ربع صدی پر پھیلے ہوئے وہ تعلّقات اختتام پذیر ہو گئے جو پورے بیس سال نہایت گرم جوشی کے ساتھ قائم رہے اور بعد ازاں ع "کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی" کے مصداق پورے پانچ سال میں رفتہ رفتہ کم ہو کر اس حد کو پہنچے کہ وہی صُورت پیدا ہو گئی کہ ؎

بس اتنا سا تعلّق اب ان سے رہ گیا ہے — وہ مجھ کو جانتے ہیں، مَیں ان کو جانتا ہوں!

پس نوشت

کتاب کے حصہ دوم کے آخری دُو باب یعنی باب سوم وچہارم، اوّلاً 'میثاق' دسمبر ۱۹۷۶ء میں ایک مسلسل تحریر کی صُورت میں شائع ہوئے تھے۔ اس پر جو حوصلہ افزا تائید وتحسین بے شمار حضرات کی جانب سے موصُول ہوئی اُن میں سے دُو بزرگوں کی قدر افزائی راقم کے لیے سرمایۂ حیات کا درجہ رکھتی ہے۔

چنانچہ مولانا سید محمّد یوسف بنوری ؒ نے ایک ملاقات میں نہ صرف یہ کہ اس تحریر کی کامل تصویب فرمائی بلکہ اپنی دُو عربی تصانیف بھی ہدیہ فرمائیں جن میں سے ایک بعض جدید تفاسیر پر نقد و جرح ہی پر مشتمل تھی۔

دوسری تحریری تائید وتحسین مولانا عبدالملک جامعی مدّظلّہٗ 'مہاجر مدینہ' کی جانب سے ایک خط کی صورت میں موصول ہوئی تھی جو مارچ ۱۹۷۷ء کے 'میثاق' میں کور کے اندرونی صفحے پر "بریدِ حرم" کے عنوان سے شائع کر دیا گیا تھا۔ (جس کا عکس اگلے صفحے پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔) اس میں انہوں نے جو ذاتی تاثّرات بیان فرمائے اُن پر مستزاد میرے لیے نہایت مسرّت انگیز بات یہ تھی کہ ع "ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے!" کے مصداق اس تحریر کا ذکر مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں شیخ الحدیث مولانا محمّد زکریا ؒ کی محفل میں ہوا۔ جیسے کہ مولانا جامعی کے خط سے ظاہر ہے اس سے قبل میرا اُن سے کوئی تعارف نہ تھا۔ البتہ بعد میں اُن سے جو دو ایک ملاقاتیں ہوئیں اُن میں یہ تفصیل معلوم ہوئی کہ جب مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی مدّظلّہٗ ملاقات کے لیے حضرت شیخ الحدیث ؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے دریافت فرمایا کہ یہ تحریر اُن کی نظر سے گزری ہے یا نہیں ہے اور جب جواب نفی میں ملا تو ارشاد فرمایا: "یہ 'میثاق' لے جاؤ اور اسے ضرور پڑھو لیکن پڑھنے کے بعد پرچہ مجھے واپس کرنا نہ بھولنا!"

میرے لیے مولانا بنوری ؒ اور شیخ الحدیث ؒ کی یہ قدر افزائی اس اعتبار سے بہت وقیع اور اہم ہے کہ؎

اُحِبُّ الصالحینَ و لَستُ مِنهم
لعلّ اللہَ یرزقنی صَلاحًا

برید حرم

"المدینة المنورہ

جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب وفقکم اللہ لمایحب ویرضی،

السلام علیکم و رحمۃاللہ _____ (بلا تعارف و تمہید!)

'میثاق' بابت دسمبر ۷۶ء نظر پڑا بحث دلچسپ تھی ساری پڑھ گیا۔ صفحہ ۳۶ تک تو مجھے اپنی ہی داستان معلوم ہوئی۔ فضل خدا وندی یہ ہے کہ مودودی صاحب کی تحریک پہلی ملاقات کے پہلے گھنٹے (۱۹۳۷ء) ہی میں سمجھ میں آ گئی تھی اس لیے وہ پہلی ملاقات ہی آخری بن گئی رسالہ دیکھ کر اور مضمون پڑھ کر خوشی ہوئی ملت ابھی عقیم نہیں ہوئی اور اردو ادب ابھی یتیم نہیں ہوا ہے(اگر چہ دو ستارے، عظیم ستارے ابھی جنوری میں ڈوب گئے(ماجد, رشید رحمہما اللہ !)مولانا اصلاحی میرے اولین اور عظیم ترین اساتذہ میں ہیں (۱۹۲۳ء) بچپن کی تعلیم و تربیت بہت کچھ ان ہی کی مرہون منت ہے ، اختلاف آپ کو بھی ہو سکتا ہے اور مجھے بھی - - - - یہ تو جملہ معترضہ تھا بہر حال مجھے رسالہ دیکھ کر خوشی بہت ہوئی ، انداز پسند آیا تجزیہ نگاری میں آپ کو اپنا مگر کامیاب تر حریف پایا - - - آپ کی دلچسپی کے لئے یہ بھی عرض کر دوں کہ جناب کا یہ "مجلہ اسرار" مجھے مولانا علی میاں کی قیام گاہ پر اتفاقاً ملا - بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب نے مولانا علی میاں کو واپسی کی شرط پر مطالعہ کے لئے عنایت فرمایا ہے - مولانا موتمر کی شرکت کے لیے تشریف لے گئے اس عرصہ میں میں نے اس کو پڑھ ڈالا کیا یہ بتلانے کی ضرورت ہے کہ مولانا علی میاں آج کل مدینہ منورہ جامعہ اسلامیہ کی دعوت پر "موتمر الدعوۃ" میں آئے ہوئے ہیں ، حضرت شیخ الحدیث تو یہاں قیام فرما ہیں ہی اور اس بندہ کو اللہ تعالیٰ پاکستان کی ولادت سے پہلے ہی لے آئے تھے - سن وہی تھا بلکہ مہینہ بھی ' بس اللہ کو میری نیت ہجرت کی لاج رکھنی تھی - - - میں نے 'میثاق' بہت عرصہ بعد آج ہی دیکھا ، پہلے کبھی جب دیکھا تھا جب مولانا کی ادارت میں نکلا تھا -

آپ کا ایک نیا نیاز مند : محمد عبدا لملک

مراقب و مفتش مدارس القرآن مدینہ منورہ
و خادم محمدعلی اکادمی و خادم بزم اردو مدینہ منورہ"

بقیہ: حرفِ اوّل

'دعوت رجوع الی القرآن' طے پایا ہے اور ان محاضرات میں اسی کتاب کے مندرجات کو مرکز و محور کی حیثیت حاصل ہو گی اور اسی کے مباحث کو بالعموم موضوعِ گفتگو بنایا جائے گا لہٰذا مقررین و مقالہ نگار حضرات کی سہولت اور سامعین و شرکاء کی ذہنی تیاری کو مدّ نظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ کتاب کے ابتدائی دو حصوں کو جو ترتیب و تسوید اور تسویہ و کتابت کے مراحل سے گزر چکے ہیں، 'حکمت قرآن' کے خصوصی شمارے کے طور پر اواخرِ دسمبر تک شائع کر دیا جائے۔

زیر نظر شمارے میں شائع شدہ تمام ہی مضامین سوائے مقدمۂ کتاب کے، گزشتہ چار پانچ سالوں کے دوران مختلف اوقات میں 'حکمت قرآن' کے صفحات کی زینت بن چکے ہیں اور اس پہلو سے اُن قارئین کے لئے جو آغاز ہی سے اس پرچے کے خریدار رہے ہوں، ان مضامین میں دلچسپی کا شاید بہت زیادہ سامان نہ ہو گا۔ تاہم علمی و فکری رہنمائی کے حامل ان وقیع مضامین کا ایک نئی ترتیب کے ساتھ مربوط انداز میں یکجا سامنے آنا افادیت سے یکسر خالی بھی نہیں۔ بالخصوص کتاب کا مقدمہ جو اسی شمارے میں شامل ہے اور جسے محترم ڈاکٹر صاحب نے حال ہی میں تحریر کیا ہے، قارئین کے لئے خصوصی دلچسپی کا باعث ہو گا۔ اس لئے کہ ڈاکٹر صاحب محترم کی پچھلی ربع صدی کی جدوجہد کو "مری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو" کے مصداق اگر ایک جامع عنوان دیا جائے تو وہ 'دعوت رجوع الی القرآن' ہی قرار پائے گا۔ شاید یہی سبب ہے کہ اس تازہ تحریر کی ایک ایک سطر میں جسے ڈاکٹر صاحب کے فکر کا نچوڑ ہی نہیں اُن کی عملی کاوشوں کا خلاصہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے، اُن کا سوزِ دروں صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے اور اس اعتبار سے بلاشبہ یہ تحریر نہایت خصوصی اہمیت کی حامل ہے ○○○

قارئینِ کرام!

نوٹ فرما لیجئے کہ لفافہ پر چسپاں سلپ پر آپ کا نام و پتہ اور زرِ تعاون ختم ہونے کی تاریخ درج ہے۔ اگر آپ ان میں کوئی غلطی پائیں تو مذکورہ 'سلپ' پر ہی درستی کر کے ہمیں ارسال فرما دیجئے نیز آئندہ خط و کتابت کرتے وقت حوالہ کے لیے سلپ پر درج کمپیوٹر کا حوالہ دینا نہ بھولیے گا!

شکریہ: سرکولیشن مینیجر

ناشر: ناظمِ مکتبہ، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، مطبع: آفتاب عالم پریس لاہور، اِس شمارے کی قیمت -/۱۰ روپے

FEBRUARY 1990

Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT_E_QURAN
LAHORE

VOL. 9
NO.1-2

ماہنامہ میثاق کے ۶۸-۱۹۶۷ء کے اداریوں پر مشتمل

ڈاکٹر اسرار احمد

کی ایک اہم تالیف:

اسلام اور پاکستان

جسے بجا طور پر تحریکِ پاکستان کے تاریخی و سیاسی پس منظر اور
اسلامیانِ پاکستان کے تہذیبی و ثقافتی پس منظر پر ایک جامع و مربوط
دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔

نیا ایڈیشن، نئی خوبصورت کتابت اور دیدہ زیب طباعت کے ساتھ شائع ہو گیا ہے

قیمت: اعلیٰ ایڈیشن (مجلّد) -/۴۰ روپے اشاعتِ عام: -/۵ روپے

شائع کردہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدّام القرآن، ۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور